فرشتے خاموش ہیں
دیویندر تیواری

Veerinder Patwari
"Prem Kunj"
BOHRI TALAB TILLO
JAMMU TAWI

فرشتے خاموش ہیں

جناب منظور مظلوم صاحب

کی خدمت میں

خلوص کے ساتھ

سیمانت پرکاشن
۹۲۲ کوچہ روحیلا خاں
دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت :- سولہ روپے
ناشر :- نریندر ناتھ سوتر
سیمانت پرکاشن
۹۲۲ کوچہ روحیلا خان
دریا گنج - نئی دِلّی - ۱۱۰۰۰۲
سرورق ساجد
بارِ اوّل ۱۹۸۰ء
تعداد ۱۰۰۰
طابع نعمانی پریس ترکمان گیٹ دہلی

FRISHTE KHAMOSH HAIN (STORIES)
VEERINDER PATWARI - Rs 16/-

والدِ محترم

جناب پریم ناتھ پٹواری کی نذر

ترتیب

پیش لفظ

پچھلی چوتھائی صدی میں اُردو افسانہ اِرتقاء کے کئی رنگ برنگے مراحل سے گزر کر آیا ہے۔ پریم چند کے کفن سے منیرا کے "پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ" تک کے اس سفر میں اُردو افسانہ ان گنت رنگ و رُوپ، میلانات و رجحانات اپنے وسیع دامن میں سمیٹ کر آج کے سنگِ میل کے پاس کھڑا ہے۔ تلخ زندگی کی شدّت، زندگی اور مزاج کے رشتوں کی اہمیت، افراد کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ، حیات کی پیچیدگیوں کی آگاہی، بدلتی قدروں کا احساس، اب زیادہ شدّت سے اور زیادہ بالغ نظری سے برتا جانے لگا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد یہ شدّت قدرے کم ہوگئی تھی۔ بیدی کے افسانوں بادل، لاجونتی، سارگام کے جھونکے میں بیدی کا رنگین تخیل نہیں ملتا، کرداروں کی نفسیاتی کشمکش اور اُلجھن نظر نہیں آتی، وہ نفسیاتی بنیادیں نہیں جو اُن کے پہلے کے افسانوں میں موجود ہیں۔

اسی طرح " چھوٹی موٹی " کے افسانوں میں عصمت کوئی گہرا جذباتی یا نفسیاتی عنصر پیدا نہیں کر سکی ہیں۔" چوتھی کا جوڑا " اور " سونے کا انڈا " البتہ تاریخی افسانے ہیں۔ ان میں عصمت کی زبان کا بے پناہ محاورہ موجود ہے۔ ادھر کرشن چندر کے افسانوں میں گہری حقیقت نگاری نے کسی حد تک سطحی حقیقت نگاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد احمد ندیم قاسمی نے بہتر افسانے لکھے ہیں۔ سناٹا، در و دیوار اور آس پاس کے افسانے تاثر کی وحدت اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بے حد کامیاب افسانے ہیں۔ اسی طرح غلام عباس نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اسی دوران شوکت صدیقی، انور عظیم، ٹھاکر پونچھی اور بشیشر پردیپ نے بھی بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔ سعادت حسن منٹو نے البتہ تقسیم وطن سے پہلے بھی نہایت خوبصورت افسانے لکھے ہیں اور تقسیم ہند کے بعد بھی بہت اچھے افسانے تخلیق کئے ہیں۔

بہرحال یہاں چونکہ اردو افسانے کے مختلف میلانات و رجحانات سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے بات جموں و کشمیر میں اردو افسانے کی نشو و نما سے متعلق ہی موزوں رہے گی، کیونکہ ویریندر پٹواری کے افسانوں کو اسی پس منظر میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور اس طرح مقابلتاً ایک چھوٹے کینوس میں بات کہہ دینے سے کچھ نقوش واضح طور پر دائرہ نگاہ میں آ سکتے ہیں۔

ریاست میں اُردو افسانے کو باقاعدہ روایت پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوئی ہے۔ پردیسی ترقی پسند تحریک سے متاثر ضرور تھے، مگر زیادہ متاثر وہ کشمیر کے مفلوک الحال مگر غیور اور شریف الطبع کی البیلی زندگی سے تھے۔ پردیسی کے افسانے تکنیک و مواد کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ کشمیری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اُن کی نظر بھرپور تھی اور انہوں نے زاویے بدل بدل کر کشمیری زندگی کے گونا گوں پہلو افسانوی سانچوں میں کچھ اس انداز سے ڈالے کہ ایک بالکل نیا تصوّر وجود میں آگیا۔ اس سے پہلے کشمیر سے متعلق کرشن چندر نے افسانے لکھے تھے، مگر اسی انداز کے، جس انداز سے انھوں نے کوریا سے متعلق افسانے لکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "جہلم میں ناؤ پر" کے افسانے وہ گہرا تاثر پیدا نہیں کر سکتے۔ اپنے سحر انگیز رومانی ماحول کے باوجود، جو "بہتے چراغ" "شام و سحر" کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے۔ پردیسی نے غالباً پہلی بار اُن مزدوروں کے بارے میں لکھا، جو سردی کے مہینوں میں جموں یا پنجاب کے دوسرے شہروں میں مزدوری کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے شدّت سے محسوس کیا کہ اِن مزدوروں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا اور اِن کو "ہاتو" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (کسی حد تک یہ احساس آج بھی باقی ہے اور "ہاتو" کا لفظ آج بھی استعمال کیا جاتا ہے) پردیسی کی زبان نہایت چست اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ افسانوی لہجے

کی تمام تر چاشنی سے مزین ہے۔

اسی زمانے کے آس پاس پریم ناتھ در کے افسانوں کا مجموعہ۔ "کاغذ کا واسدیو"، شائع ہو چکا تھا۔ کم وبیش "کاغذ کا واسدیو" کے افسانے بھی کشمیری زندگی کی عکاسی کے پیش نظر لکھے گئے ہیں، اور اپنی چند خامیوں کے باوجود کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ تکنیک کے لحاظ سے اِن افسانوں میں کوئی خاص جدت یا ندرت نہیں پائی جاتی۔ کوئی مصنوعی جذبہ زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتا۔ اور نہ سوچنے کا میکانکی انداز کشمیری زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے۔

بہرحال! پردیسی اور در کے افسانوں نے اُردو دُنیا کو ایک ایسے کشمیر سے روشناس ضرور کرایا، جس میں فقط گلاب کا پھول، نیلی جھیل، راج ہنس کی خوبصورتی ہی نہیں ہے۔ بلکہ سیاحوں کی اس من پسند شہزادی کے خوبصورت جسم پر کچھ داغ ہیں، کچھ ناسور ہیں۔ کچھ زخم ہیں۔ اسی دور میں رامانند ساگر، کشمیری لعل ذاکر، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور جیسے اہم افسانہ نگار فن اور ہیئت کے مختلف تجربوں میں مصروف تھے۔ کشمیر میں اُردو افسانے کی بنیاد پردیسی، در کے علاوہ قدرت اللہ شہاب، نیر سنگھ داس نرگس، گنگا دھر بٹ دیہاتی، دیا نند کپور، سومناتھ زتشی وغیرہ کی تحریروں کی مضبوط چٹانوں پر قائم ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ یہ دور ریاست میں اُردو افسانے کی نشوونما کا سنہری دور تھا۔ لیکن یہ دور جلد ہی ختم

ہوگیا۔ ایک بھیانک طوفان گرجتا ہوا آیا اور ان جگمگاتے ہوئے چراغوں کو تتر بتر کر گیا۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ ریاست میں پہلی شخصی راج کا خاتمہ ہوگیا، اور یہاں کے ادیب ایک نئے کشمیر کی نئی رُوپ ریکھا سنوارنے کے کام میں مشغول ہوگئے۔ کلچرل فرنٹ قائم ہوگیا اور یہاں کے ادیب، شاعر، فن کار، گلوکار اور موسیقار اس میں شامل ہوکے وطن کی تعمیر نو میں حصّہ بٹانے لگے۔

تقسیم وطن نے ریاست کے افسانہ نگار ٹولی کو منتشر کر دیا۔ بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے گئے کچھ ملک کے دوسرے حصّوں میں منتقل ہوگئے۔ چند ایک نے صحافت کا کام سنبھال لیا۔ چنانچہ پردیسی کی وفات کے بعد ریاست میں افسانے کی نوک پلک سنوارنے والے گنے چنے رہ گئے۔ اسی دوران چند نئے نام ابھر کر سامنے آگئے۔ شہزادیٔ شعروادب، برف پوش پہاڑیوں، شفاف جھیلوں، بید مجنوں کی قطاروں، سفیدے کی سربلندیوں، چنار کے چھتناروں سے کب تک دامن بچائے رکھتی۔ چنانچہ افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود، نئے حوصلے۔ نئے ولولے، نئے ارمان اور نئی لگن لے کر سامنے آگئی۔ علی محمد لون، پشکر ناتھ، حامدی کشمیری، برج پریمی۔ تیج بہادر بھان، اختر، محی الدین، نور شاہ، منصور بدخشی، کرن کشمیری، ویدراہی، رام کمار ابرول، برج کیتال وغیرہ تھوڑے عرصے میں ہی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان افسانہ نگاروں کا ذہن تھوڑا انقلابی تھوڑا رومانی ہے۔

یہ رومانیت پریشان نہیں کرتی، گمراہ نہیں کرتی۔ بلکہ بعض حقیقتوں کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ آج کے ذہن کی اُلجھنوں کو اِسی رومانیت کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس نسل کے افسانہ نگاروں کو کشمیر کو سمجھنے کا زیادہ موقع ملا ہے۔ اس لئے اِن افسانہ نگاروں نے زیادہ سوچ سمجھ کر کشمیری زندگی کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

ویریندر پٹواری کو افسانہ نگاری کی عمر ابھی تھوڑی ہے، لیکن آج کے ذہن کی پیچیدگیوں اور تہہ در تہہ اُلجھنوں پر ان کی نظر گہری اور بھرپور ہے۔ جدید تر نسل کے افسانہ نگاروں میں ویریندر پٹواری ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ تکنیک کے نئے نئے تجربوں، تاثر کی وحدت، فلسفیانہ صداقت کی بدولت ویریندر پٹواری کے افسانے بے حد کامیاب ہیں۔ وہ تخیل سے بہت کم مدد لیتے ہیں۔ ان کا اسلوب رنگین نہیں ہے۔ لیکن اِن کی حقیقت نگاری میں ان کے سادہ اسلوب سے جان پیدا ہو جاتی ہے۔ جنھوں نے جدید تر نسل کے بیشتر افسانہ نگاروں کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا ہو، اُنھیں ویریندر پٹواری کی زبان اور اِن کے اسلوب کی اہمیت کا زیادہ احساس ہوگا۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ویریندر پٹواری افسانوی فن سے بے پناہ روشناس ہیں ان کے یہاں جدید افسانہ اور روایتی افسانہ کا ایک ایسا امتزاج پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی نسل کے افسانہ

نگاروں میں اِن کی حیثیت ایک نمائندہ افسانہ نگار کی ہوتی ہے۔

ویریندر پٹواری کے اس مجموعے میں چند افسانے ایسے ہیں، جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ کچھ افسانے ملک کے جریدوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ غیر مطبوعہ افسانوں میں ماں، دھنا، دیوک، خواب خواب، ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے کچھ ایسے پہلو نمایاں کرتے ہیں کہ ہم ویریندر پٹواری کو صرف ایک اُبھرتا ہوا افسانہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ یہ مقام تو ایک منجھے ہوئے، سُلجھے شعور والے افسانہ نگار کا مقام ہے اور ویریندر پٹواری نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس بات کا اندازہ آپ کو ان کے افسانے پڑھنے کے بعد ہو گا۔

آج کا افسانہ نگار ایک عجیب طرح کے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ آج زندگی اس قدر اُلجھ گئی ہے کہ اس اُلجھن کا پرتو افسانے نگار کے ذہن تک پہنچ گیا ہے۔ پُرانی قدریں مر رہی ہیں۔ کچھ نئی قدریں اُبھر رہی ہیں۔ انسانی ذہن کچھ نئی پیچیدگیوں سے روشناس ہو رہا ہے یہ پیچیدگیاں پریشان کرنے لگی ہیں۔ افسانہ نگار اس اُلجھن کو، اس کرب کو، اس پریشانی و افراتفری کو زبان دینے کے لئے اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ جدید افسانے میں یہی تلاش ہمیں نظر آتی ہے۔ اظہار کی نئی راہوں کی طرف جدید افسانہ اشارہ کر رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پریشان کن

خیالات ذہن کے اُلجھاؤ کے نہ سمجھ میں آنے والے منظر۔ پارے کی طرح بے قرار، پھسل پھسل جانے والے لمحے ۔ اِن لمحوں کو بیان کرنے کے لیئے نئے اسلوب، نئی ہیئت اور نئی فکر کی ضرورت کا احساس۔ ایک بار پھر افسانہ ایک آزمائشی دور میں آ گیا ہے۔ ہمارے نئے افسانہ نگاروں کو اس دور کے کرب کو سمجھنا ہوگا۔ کرداروں کے ماحول اور اُن کے مزاج کے رشتوں کو زیادہ اچھی طرح پرکھنا ہوگا۔ فلسفیانہ صداقت سے مزید کام لینا ہوگا۔ وسعتِ حیات کی پیچیدگیوں کا اندازہ کرنا ہوگا۔ اور ایک جُراءت سے کام لینا ہوگا۔ اسی جُراءت نے بسمہ پیترا، کالو بھنگی، ممی، ٹوبہ ٹیک سنگھ، ہتک، گنڈاسا، لحاف، مہالکشمی کا پل جیسے افسانے تخلیق کرائے ہیں۔

جدید میلانات اور رجحانات نے نئے افسانہ نگاروں کو شدّت سے اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ریاست میں نئے افسانہ نگاروں کی پود نے اس شدّت کو محسوس کیا ہے۔ ویریندر پٹواری اسی پود کا نمائندہ افسانہ نگار ہیں، جس میں کلدیپ رعنا جیسے منجھے ہوئے افسانہ نگار شامل ہیں عمر مجید، وجے سوری، عبدالغنی شیخ، نعیم اختر، اوپی شرما اس پود کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ ویریندر پٹواری نے اِن افسانوں میں جو مجسّمے تراشے ہیں۔ ان کو سمجھنے سے اس پود کے افسانہ نگاروں کی روش کا پتہ چلتا ہے۔ ریت کی دیوار روشنائی سے سلولائیڈ تک، انتظار، کاغذ کے پھول اور

پیاسی سیب ایسے افسانے ہیں، جو ہمیں ویریندر پٹواری سے
بہت سی امیدیں وابستہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ویریندر پٹواری
کے فن کو کسی انداز سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اِن کی لگن، ایمانداری
اور نمک حلالی کا اندازہ اِن کا افسانوں کو پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔

پُشکر ناتھ

ایک اشارے کے ساتھ اس نے کار روک لی اور خوفزدہ ہوکر سپاہی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے ؟ راستہ بند ہے کیا ؟"

"تلاشی ہو رہی ہے صاحب !"

"تلاشی ——!" وہ ایسے چونک پڑا جیسے بجلی کے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اور اس کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر ایسے پھسلنے لگے جیسے کوئی دوڑتے دوڑتے اپنا توازن کھوکر برف کے تختے پر پھسلنے لگا ہو۔ گھبراہٹ سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ شدّت کی سردی کے باوجود اس کا چوڑا ماتھا پسینے سے تر ہو گیا۔ ماتھے پر لگا ہوا سیندور کا بڑا سا تلک پسینے سے جدوجہد کرتا ہوا اپنا وجود کھو بیٹھا اور خون کے دھبّے کی طرح نہایت بے ترتیب

طریقے سے ماتھے پر پھیل گیا۔ سفید رنگ کی پگڑی سر پر دباؤ ڈالنے لگی لیکن پھر بھی اس نے ہمت کر کے کار کی ہیڈ لائیٹس بند کی اور کھڑکی کا شیشہ چڑھا کر وہ اگلی سیٹ سے فوراً اتر کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھونسی ہوئی اس بیوقت کی پریشانی کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر جمی ہوئی برف کی تہیں جب اسے یوں گھور گھور کر دیکھنے لگیں جیسے دشمن بھیس بدل کر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہو تب وہ اپنی کیفیت بھانپ کر ایک کمزور دل سپاہی کی طرح کانپنے لگا۔ تشویش پر قابو پانے کی خاطر سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا وہ بار بار اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ لیکن آس پاس سوچ بچار کی یہ ترکیب ویسے بھی کا مظاہرہ دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کی نقل و حرکت دیکھنے والے سردی سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر خود ہی بے بسی کا تماشہ بنے بیٹھے ہیں اور پولیس کی مشکوک نظریں بہت آگے کسی گاڑی کی تلاشی میں مصروف ہیں۔

کار کی پچھلی سیٹ کچھ زیادہ آرام دہ تو نہیں۔ مگر وہاں ایک چھ سال کی لڑکی لیٹی ہے تن پر مختصر کپڑے پہنے یہ لڑکی سردی سے سکڑ گئی ہے۔ اس کے دانت بج رہے ہیں اور وہ اونگھ رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے وہ بچی کے معصوم چہرے کو دیکھتا رہا اور جوں ہی اس نے اس پھول سے بھی زیادہ نازک لڑکی کو گود میں اٹھا لیا تو وہ اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جو سردی سے بچنے کی خاطر بار بار حرکت میں آکر لبادہ مانگ

رہے تھے چند ہی لمحات کے بعد حرارت کی وجہ سے راحت محسوس کرنے لگے اور نیند کی گہرائی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی

برف باری تقریباً دو گھنٹے پہلے بند ہو چکی تھی۔ لیکن سرد ہوائیں کار کو یخ بستہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اپنے کاندھے سے چادر اُتار کر اس نے لڑکی کو مکمل طور پر ڈھنک دیا اور کار سے نیچے اُتر کر لڑکی کو گلے سے لگا گئے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں کسی محفوظ جگہ کی متلاشی تھیں۔ اور ایسی جگہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ دائیں طرف اونچے اونچے پہاڑ کی ڈھلوان ہے اور اونچے اونچے دیودار کے درخت اندھیرے میں ایک سیاہ پوش جلاد کے چہرے کی مانند ڈراؤنی اور معنی خیز ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی نظریں جھک جاتی ہیں ـــــ دائیں طرف پہاڑ کے دامن میں ایک دریا ہے دریائے چناب جو رات کے اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتا۔ مگر رواں دریا کی آواز غار میں چھپے ہوئے جن کی طرح غرغرا رہا ہے اور خاموشی کو چیرتی ہوئی یہ آواز کس قدر بھیانک ہے، یا موجوں سے ٹکراتے ہوئے پتھروں کی کراہ ہے یا کٹتی ہوئی لہروں کا کرب۔ وہ ایک لمحے کے لئے سوچتا رہا اور خوف نے جب اُسے پیچھے دھکیل دیا تو وہ مڑ کر پیچھے دیکھتا رہا ـــــ!

تاریکی کی چادر اوڑھے اس سڑک کے چپہ چپہ سے وہ بخوبی واقف ہے۔ بچپن میں جو ایک پگڈنڈی تھی اب ایک

کشادہ سڑک ہے - بچپن میں یہ ایک تکلیف دہ سفر تھا - مگر اب بڑھاپے میں ایک بہت ہی سہانا و آرام دہ سفر بن گیا ہے - لیکن آج — وہی راستہ ہے - وہی جانے پہچانے گام اور نہ ہی اپنا معمول کا کام - مگر یہ تو سفر پرُسکون ہے اور نہ ہی حسب منشا ر ایسا کیوں ہے - جوانی سے بڑھاپے تک جس راستے نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا ہے گاؤں سے شہر پہنچایا ہے آج اچانک اُس سے مُنہ پھیر کر پولیس کے قبضے میں کیوں آ گیا ہے - وہ سوچتا رہا - اور اپنے آپ سے گھبرا کر آگے دیکھنے لگا - آگے رُکی ہوئی ٹریفک ، چند کاریں ، ٹرک ، گاڑیاں اور پولیس والوں کی ویان ہے - جس کی لال رنگ کی بیک لائٹ ایک راکھشش کی خون آلودہ آنکھوں کی مانند خونخوار اور بھوکی لگتی ہیں -

آگے پیچھے دائیں بائیں بار بار دیکھ کر کچھ دیر وہ سڑک پر ایسے چہل قدمی کرنے لگا جیسے کہ ایک کھلاڑی فیصلہ کر رہا ہو کہ مقابلہ کروں یا شکست کا سامنا کرنے سے پہلے فرار ہونے کی کوئی معقول یا غیر معقول صورت نکالوں - وہ ایک کہانی کار کی طرح مختلف خاکے بناتا رہا - لیکن اس کا ہر ارادہ عملی جامہ پہننے سے پہلے ہی خوف اور ڈر کے دلدل میں پھنس کر دم توڑتا رہا -

اچانک جب گھبراہٹ نے خیالات و احساسات پر قبضہ کر لیا تو وہ لڑکی کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر ایسے دوڑنے لگا جیسے اس کا

ہر قدم اس کو خطرے سے دور لئے جا رہا ہو۔ مگر تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہی پولیس انسپکٹر سے ٹکرا کر اس کے قدم رک گئے اور خوف جب ایک جاتے پہچانتے طا قتور دشمن کی طرح دل و دماغ کے دروازوں پر دستک دے کر للکارنے لگا تو وہ اپنے پھولتے ہوئے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا:

" مجھے آپ کیوں روک رہے ہیں۔ میں جلدی میں ہوں۔ آپ میری مجبوری کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

" صاحب۔ مال برآمد ہوا ہے۔" ایک سپاہی نے اس کی احتجاج بھری التجا کے درمیان لوک کر انسپکٹر سے کہا اور وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ مجبوراً اپنے تیز قدموں پر قابو پاتا ہوا وہ بھی انسپکٹر کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

" کیا مجرم پکڑا گیا؟" کسی نے سوال کیا۔

" نہیں۔ مگر بچ کے جائے گا کہاں۔ یہیں کہیں چھپ کے بیٹھا ہوگا۔"

" کیا لئے جا رہا تھا؟"

" نیلم " لوگ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

" نیلم !" تو تلاشی پتھر کے ٹکڑوں کی خاطر لی جا رہی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس کی تھر تھراتی کانپتی ہوئی ٹانگیں رک گئیں اور وہ اپنے احمقانہ ڈر پر مسکرانے لگا۔ ہنسی نے خوف اور گھبراہٹ

کو ایسے ختم کر دیا جیسے ایک اچھا خیال وہم کو ایک ہی وار میں ختم کر دیتا ہے۔

"آپ یہاں دستخط کر دیجئے صاحب اور اپنا نام بھی بتا دیجئے"۔ انسپکٹر کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور خوف ایک بار پھر زخمی سانپ کی طرح آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگا۔

"کیوں ؟"، اس کی آواز سے غصّہ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"آپ بزرگ ہیں، بھلے مانس ہیں۔ آپ سے اچھا چشم دید گواہ اور کون ہو سکتا ہے"۔ ایک سپاہی نے ادب اور احترام سے گزارش کی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک خوفناک آواز نے سب کو چونکا دیا گویا کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ حرکت میں آتی ہوئی گاڑیاں رک گئیں۔ سڑک جو گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس سے منور ہو چکی تھی ایک بار پھر تاریک ہو گئی۔ کار کس طرح سڑک پار کر کے پھسلی اور چناب میں جا گری۔ یہ جاننے کی کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ غالباً اس لئے کہ سڑک پر اتنی پھسلن ہو گئی تھی کہ پیدل راہ رو بھی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر ذرا سی کھوج کے بعد سبھی کو یقین ہو گیا کہ کار دریا کی گہرائی میں ایسے گر گئی ہے جیسے بھوکے کے کھلے ہوئے منہ میں روٹی کا ٹکڑا۔

وہ تا چیخنے لگا، چلانے لگا۔ عورتوں کی طرح اپنی چھاتی پیٹ

پیٹ کر روتے ہوئے ایک باوقار بزرگ کو دیکھ کر کچھ لوگ خدائی قہر کو کوسنے لگے۔ کچھ لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور خود اس کی سلامتی کی مبارک باد دینے لگے۔ جب کہ انسپکٹر کار کے بیمہ کے بارے میں بار بار پوچھ تاچھ کرتا رہا۔

کسی کو جواب دیئے بغیر وہ زار زار روتا رہا۔ اس کا علم کسی کو نہیں تھا کہ کار میں ایک معصوم لڑکی بھی تھی۔ خوف کا شکار ہو کر اس نے کار کو خود ہی نیوٹرل کر کے پھسلن والی سڑک پر دھکیل دیا تھا۔ مگر اس کو وہ راز ہی میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بدنصیب لڑکی کا ذکر کرتا ایک بدشگونی کے خیال نے چونکا دیا اور وہ ٹوٹے ہوئے دل کو تسلیاں دینے لگا۔ چلو اچھا ہوا جو اس منحوس لڑکی سے چھٹکارا مل گیا۔ پتہ نہیں زندہ رہ جاتی تو نہ جانے کیا کیا تباہیاں پھیلاتی۔ پہلے ہی روز کتنی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لڑکی کے لئے اسے کچھ خرچ تو نہیں کرنا پڑا تھا۔ بے دام کی۔ اغوا شدہ لڑکی تھی۔ جو کم از کم دو ہزار روپے میں بک ہی جاتی۔ مگر اتنی منحوس تھی کہ میرے بیس سالہ تجربے کے چاند پر گہن ضرور لگ جاتا اور لوگ جان جاتے کہ میں جنگلات کا ٹھیکیدار نہیں .... بلکہ وہ اپنے آپ سے خوف زدہ تھا۔ زندگی کی یہ پہلی شکست، ایک بڑا شگون تھی، لیکن ویسے لڑکی کی قربانی اسے دلاسا بھی دے رہی تھی۔ اچانک برف باری پھر شروع ہو گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ لڑکی پتھر

پر بلیٹھی سسک رہی ہے۔ وہ گھبرا گیا، پلٹ کر دیکھا تو برف سے ڈھکا ہوا پتھر اسے معنی خیز نظروں سے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"کار بالکل نئی تھی صاحب۔ کم از کم تیس ہزار میں بک جاتی۔ خدا جانے بیمہ والے رقم پوری کر بھی دیں گے یا نہیں"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا مگر زبردست برف باری نے اس کے اردگرد جمع لوگوں کو تتر بتر کر دیا۔

دریا کی لہریں ایک معصوم لڑکی کی لاش گود میں اٹھائے، ایک بدنصیب ماں کی طرح کرب سے چیختی چلاتی بہہ رہی تھیں۔ آسمان آنسو بہا رہا ہے۔ دھرتی اپنے ہونٹ سیئے سسک رہی ہے اور فرشتے خاموش ہیں!۔

ماں

ماں جب ہنستی ہے تو ماتم چھا جاتا ہے اور جب وہ روتی ہے تو اس
کے چاہنے والے اس کے آنسوؤں کو ایک اچھا شگون سمجھ کر خوشی سے جھومنے
لگتے ہیں۔ انھیں ماں کی روحانی طاقت پر بھروسہ ہے تبھی وہ اُسے
بگلی کی بجائے بگلی ماں یا فقط ماں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ عقیدت
مند لوگ اس کے چہرے کی افسردگی یا مسرت کے تاثرات میں اپنی تقدیر
کا عکس دیکھتے رہتے ہیں۔ اپنے سوالات کا جواب تلاش کرتے رہتے
ہیں۔ طالب علم اپنا نتیجہ، عاشق اپنا انجام، ماں اپنے ہونے والے
بچے کی جنس اور تاجر اپنا مقدّر ماں کے چہرے میں دیکھنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ گویا سوالات کا جواب ماں کے قہقہے عیاں کر دیتے ہیں۔
اس سائنسی دور میں ایک معمولی سی عورت کے پاس اتنی طاقت

کیسے آگئی؟ یہ کوئی فریب یا مکاری تو نہیں ـــــــ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میری معقول سوچ سمجھ میری پریشانیوں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے تھک کر خود ہی وہم کے دلدل میں پھنس جاتی ہے تو میرا اعتماد بھی اعتقاد کے سامنے جھک جاتا ہے اور تدبیر تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ میں ایک نامور بچوں کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر پیروں کے آستانوں، فقیروں کے مزاروں اور یہاں تک کہ کبھی کبھی لنگڑی ماں کے آگے پیچھے گھومتا پھرتا ہوں۔ آخر ایک نئے بیس ڈاکٹر، ایک دِل شکستہ باپ کی رائے قبول نہ کرے یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟

ماں تقریباً روز ہی میرے گھر آتی ہے۔ برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے وہ اکثر کھڑکی سے جھانک کر میرے بیٹے کو دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے اور اس کا مسکرانا عام اعتقاد کے مطابق میرے بیٹے کی بدنصیبی کی عکاسی کرتا ہے۔ میرا بیٹا واقعی بدنصیب ہے۔ ورنہ کیا وہ دس سال کی عمر میں بھی چل پھر نہیں سکتا؟ پولیو کا علاج نہیں۔ یہ تو ایک عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے۔ لیکن میں ماں کا چہرہ دیکھ کر ہر بار یہی اُمید کرتا ہوں کہ شاید ماں آنسو بہادے اور میرے بچے کی پتلی پتلی ٹانگیں حرکت میں آنے لگیں اور پھر میرا مُنّا دوڑے گا کھیلے گا۔ کرکٹ بیڈمنٹن۔ سائیکل پر سوار ہو کر ریس کرے گا، کار چلائے گا۔ لیکن ماں روتی نہیں اور میرا لڑکا بستر پر ایک زندہ لاش کی طرح ہی پڑا رہے گا۔

ماں جب چلی جاتی ہے تو میں یہی سوچ کر اپنے لب سی لیتا ہوں ۔
آج بھی ماں میرے برآمدے میں ٹہل رہی ہے ۔ مگر مسکراتے
کی بجائے آج وہ اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر زار زار رو رہی ہے ۔
لوگ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر اپنی اپنی مرادیں لے کر اس کے گرد
جمع ہونے لگے ہیں ۔ انھیں ماں پر پورا بھروسہ ہے ۔ آخر کیوں نہ
ہو ۔ اعتقاد انسان کو لاکھ اندھا بنا دے مگر جانے پہچانے راستوں
پر چلنے کا ہنر بھی تو سکھا دیتا ہے ۔ ماں نے بھی ان کو ایک آزمائے
ہوئے راستے پر چلنا سکھایا ہے ۔ پھر وہ کسی نئے راستے کی کیوں تلاش کریں
یہ سوچ کر میں بھی اسی راستے پر چلنے لگا تھا لیکن ماں کا اصلی روپ دیکھ میں نے راستہ بدل دیا ۔
ماں کون ہے ، شاید شہر میں کوئی نہیں جانتا لیکن میں نے
اُسے پہچان لیا ہے ۔ اس کا اصلی روپ اِس روپ سے کتنا مختلف
ہے یہ جاننے کی کسی کو فرصت ہی کہاں ہے ۔ لیکن میں آج ماں کا
اصلی رُوپ عیاں کر دوں گا ۔
پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس ، میلی کچیلی چھوٹے سے قد کی یہ عورت
دن کو اکثر گلی کوچوں میں گھومتی رہتی ہے ۔ لیکن رات کو وہ کہیں غائب ہو
جاتی ہے ۔ کوئی نہیں جانتا کہاں ۔ لیکن میں جان چکا ہوں ۔
دن کو لوگوں کے گھروں میں بنا روک ٹوک داخل ہونا ۔ کھڑکیوں
سے اسکول کے بچّوں کو چوری چھپے جھانک کر دیکھنا ۔
چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پکڑنے کی خاطر ان کے پیچھے بھاگنا

یا پھر سڑک کے بیچ کھڑی ہو کر جنگلی بلیوں کی طرح غرّاتا اس کا معمول ہے کبھی کبھی وہ بے ہودہ حرکتیں بھی کرتی ہے لیکن لوگ اس کی بے ہودگی کو نظر انداز کرکے فقط اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر ماں قہقہے لگائے تو گویا کسی ناگہانی آفت کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور اگر وہ رونا شروع کر دے تو سڑک کا ہجوم ایک کاروان بن کر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے گویا کسی جھانکی کے پیچھے ایک جلوس جا رہا ہو۔ ماں کہاں سے آئی ہے، اس کا کوئی وارث ہے بھی یا نہیں یہ کوئی کس سے پوچھے اور بھلا کون بتلائے۔ ماں خود تو بول نہیں سکتی۔ فقط سیٹی بجاتی ہے اور وہ بھی ایسے جیسے کسی کا دل بہلانے کے لئے کوئی دھن بجا رہی ہو۔

ماں کو اس شہر میں آئے تقریباً دس سال ہو گئے شروع شروع میں لوگ اس کی حرکتوں کو عیب سمجھ کر اُسے تنگ بھی کرتے تھے اور کبھی مارتے پیٹتے بھی تھے لیکن اب ان معیوب حرکتوں کو متبرک درشن سمجھ کر وہ اپنا سر تسلیم خم کئے دیتے ہیں۔ خاص طور پر جب وہ اپنے دانت پیستے ہوئے دائیں بائیں اوپر نیچے سر ہلا کر یوں چیخ پڑتی ہے جیسے اس پر کوئی دورہ پڑا ہو۔ ماں پر جب بھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ کسی نہ کسی مرد یا عورت، جوان یا بوڑھے، بچے یا سڑک پر لگے بجلی کے کھمبوں سے چمٹ کر اپنی قمیص اوپر اٹھاتی ہے اور اپنے پستان دکھا دکھا کر کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

پھر بے لبس ہو کر یوں دوڑتی ہے جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ یا خود وہ کسی کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ کبھی وہ وقت پاتھ پر لیٹ کر اپنی عریاں چھاتی کو اپنے ہاتھوں سے مسلتی رہتی ہے۔ لیکن اس بے ہودہ پن کو دیکھ کر بھی اس کی روحانیت پر یقین نہ رکھنے والے بھی اس کو روکنے یا ٹوکنے کی ہمّت نہیں کر سکتے۔ ماں کی کیفیت ایک سیلابی دریا کی مانند ہے۔ اس کو کوئی روکے بھی تو کیسے؟ وہ ننگی ہو کر برقی تار بن جاتی ہے۔ اور چھونے والا خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ ایک بار جب ایک پولیس مین نے اُسے زبردستی پکڑ کر قمیض پہننے پر مجبور کیا تھا تو لوگوں نے اگلے ہی لمحے شیر کی طرح گرجنے والے سپاہی کو ٹرک کے نیچے تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ماں کا قہر تھا جو سپاہی پر ٹوٹا تھا۔ محلے کے ایک بدکردار جنس زدہ لڑکے نے ایک دن پیار سے ماں کی چھاتی کو چھو لیا تو ماں ایک پالتو بلّی کی طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ زمین پر لیٹ کر اس نے اس لڑکے کو جب اپنے سینے سے لگایا تو لڑکے نے جانے کیا کیا تھا کہ ماں زور سے چیخ پڑی۔ لڑکا ڈر گیا اور ماں کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس روز دن بھر وہ اس لڑکے کے دروازے کو پکڑ کر قہقہے لگاتی رہی۔ اُسی رات محلے میں آگ کی زبردست واردات ہوئی جس میں وہی لڑکا جھلس کر مر گیا۔

ماں کے ایسے بہت سے واقعات مشہور ہیں اور اس کے رونے دھونے سے وابستہ کتنی ہی کہانیاں سُنی جاتی ہیں۔ لازمی طور پر

ماں کا میرے برآمدے میں زار زار روتا مجھے اپنے لئے ایک اچھا شگون سمجھنا چاہئے تھا، مگر میں نے ایسا نہیں سمجھا۔ ماں کا اصلی روپ دیکھ کر آج میں خوش ہونے کی بجائے اپنے آپ سے خوفزدہ ہو رہا ہوں۔ اور صرف رونا چاہتا ہوں۔

کل کی بات ہے میری بیوی منے کو جب ہماچل پردیش میں رہنے والے کسی درویش کے پاس لے گئی تو میں اسٹیشن سے لوٹتے ہی بستر پر نیم دراز اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا اور ماں تقریباً دوڑ کر جب میرے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو میں ایک گیند کی طرح اچھل پڑا۔ ماں کی صورت بہت ڈراونی تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں، جسم کے عریاں حصے سب تارکول سے کالے ہو گئے تھے۔ بال ماتھے سے چپک گئے تھے اور وہ آنکھیں دائیں بائیں یوں گھما رہی تھی جیسے بلی چوہے کی تلاش کر رہی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرانے لگی اور میز پر رکھی منے کی تصویر کو دیکھ کر جب وہ قہقہے لگانے لگی تب وہم کے ٹھینگوں سے میری اُمید کا آخری مینار بھی ٹوٹتا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ اب میرا بیٹا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے جذبات و احساسات کو تھپکیاں دے دے کر سلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ماں کے چہرے میں اُمید کی کرن دیکھنے کے لئے اُس کے بھیانک چہرے کو یوں تک رہا تھا جیسے مندر پر سجائی ہوئی مورت

سامنے رکھی ہوئی ہو۔ کاش ماں پھوٹ پھوٹ کر رو تی ۔ میں اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بار بار سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں فریاد کرتا رہا اور ملتجی نظروں سے ماں کے چہرے کو دیکھتا رہا کہ شاید ماں رو کر میرے حق میں فیصلہ سُنا دے۔ لیکن ماں کسی چیز کی تلاش میں تھی۔ اور پھر وہ کسی چیز پر ایسی جھپٹ پڑی جیسے بلّی نے چوہے کو دبوچ لیا ہو، اور اسے اپنی قمیص کے نیچے چھپا کر تیزی سے باہر نکلی اور تیز رفتار سے بھاگتی رہی۔ میں بھی بنا کچھ سوچے سمجھے اس کے پیچھے سرپٹ دوڑتا رہا، دوڑتا رہا۔

شہر سے دُور جب ہم دونوں شمشان کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے تو ماں کے قدم رُک گئے۔ اُچھل اُچھل کر مردوں کی طرح دوڑنے والی یہ عورت سنجیدگی سے سنبھل سنبھل کر چلنے لگی اور ایک گوشے میں پڑا ہوا پتھر ہٹا کر زمین کھودنے لگی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ میرے ہونٹ سوکھ گئے اور حلق میں کانٹے پڑ گئے۔

زمین میں کچھ دفن کرنے کے بعد وہ یوں چیخ پڑی جیسے ایک کھوکھلا درخت تیز ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر گر پڑا ہو اور پھر سسک سسک کر روتے ہوئے میرے سامنے سے اس طرح گزر گئی جیسے میں ایک درخت کا کٹا ہوا تنا ہوں ۔ بے معنیٰ!

کیا یہ بھی ماں کا کوئی کرشمہ ہے۔ ماں کی اس کیفیت کو اپنی تقدیر کا فیصلہ قبول کرنے سے پہلے میں ماں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یہاں

کیا کرنے آئی تھی ہمت باندھ کر جب میں نے اسی جگہ کو پھر کھودنا شروع کیا تو زمین کی تہیں کاٹتے کاٹتے مجھے سب سے پہلے میرے ہی گھر سے چرائی ہوئی روٹی ملی اور پھر گلی سڑی روٹیوں کے علاوہ دودھ پلانے کی بوتلیں، کھلونے وغیرہ۔ اور آخر میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ دو یا تین سال کے ایک بچے کا ڈھانچہ۔

اور اب ماں کا اصلی روپ میرے سامنے آچکا تھا۔ وہ ڈھانچہ یقیناً اس کے بچے کا تھا جس کے لئے وہ روٹی کے ٹکڑے، کھلونے، رنگین شیشے پتہ نہیں کیا کیا سڑکوں پر اکٹھا کرتی پھرتی ہے۔ پتہ نہیں وہ بچہ سیلاب کا شکار ہوا تھا یا طوفان کا، بھوک کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر مر گیا تھا۔ ماں رو رہی ہے۔ اس کے آنسو دیکھ کر لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اس کے عقیدت مند خوشیاں منا رہے ہیں اور کیسے کیا پتہ کہ ماں مٹی میں ڈھکے ہوئے ڈھانچے کے لئے آنسو بہا رہی ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس کے آنسو پونچھ دوں لیکن سوچتا ہوں، اگر ماں کے رونے سے واقعی نصیب بدلتے ہیں تو میں کیوں اسے روکوں شاید ہماچل پردیش کے درویش کے پاس کوئی ایسی دوا یا دعا ہو جس سے منّا ٹھیک ہو جائے اور پھر وہ دوڑنے لگے کھیلنے لگے کرکٹ، فٹ بال، بیڈمنٹن، وہ کار چلائے۔ میں میں اُسے پائلٹ بنا دوں۔ !!۔ ؟۔ ؟ پھر میرے بچے کی پتلی پتلی ٹانگیں میری نظروں میں گھومنے لگیں۔ ماں چیخ اُٹھی اور میں مٹی میں دبا ہوا بچے کی ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر خود بھی چیخ پڑا۔
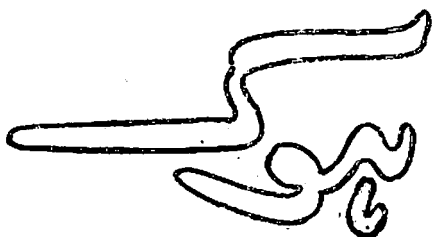
دینو شاہ کے ہونٹ تھرتھرانے لگے!

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر والی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر بغیر پڑھے ایسے پھاڑ دیا جیسے وہ لفافہ نہیں بلکہ اپنا ہی گریبان چاک کر رہا ہو۔ یہ لفافہ ہر وقت اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا۔ موقع پاتے ہی وہ دن میں کئی بار نکال کر اس میں رکھے ہوئے خط کو ایسے پڑھتا رہتا تھا جیسے وہ خط کو پہلی بار پڑھ رہا ہو اور پھر ہر بار وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب کر خلاؤں میں گھورنا شروع کرتا تھا گویا وہ لفافہ کوئی معمہ تھا اور جس کے لئے اسے کسی واحد حل کی تلاش تھی۔ ذرا سی آہٹ پا کر یا کسی جھانکتی ہوئی نگاہ کو دیکھ کر وہ جلدی سے لفافہ بند کر کے اسے جیب میں یا سرہانے کے نیچے یوں چھپا دیتا جیسے

اپنا کوئی گناہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو اور اگلے ہی لمحے وہ حقے کے ہلکے ہلکے کش لگا کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی سرچ لائٹ کی طرح دائیں بائیں گھما کر اپنے مکان میں رہنے والے کرایہ داروں کو ایسے دیکھنا شروع کرتا تھا جیسے کوئی جاسوس کسی اونچی جگہ بیٹھ کر نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہو۔

ایک مدت کے بعد آج اس نے اس لفافے کو پھاڑ کر پھینک دیا اور پھر کاغذ کے بکھرے ہوئے تنکوں کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے وہی تنکے اس معمہ کا واحد حل تھے جس کی اُسے پچھلے بیس سال سے تلاش تھی۔

دینو شاہ کا شمار شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا امریکہ میں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر کے ایک عرصہ سے وہیں مقیم ہے۔

اس کی اکلوتی بیٹی بھی ماں کی موت کے بعد بچپن میں اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی اور جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ واپس لوٹ تو آئی تھی لیکن صرف موت کے آغوش میں پناہ لے کر چھپ جانے کے لئے۔ اس لئے اب وہ تنہا ہی تھا۔

اپنے حویلی نما مکان میں اگر اسے کوئی تکلیف تھی تو وہ فقط اکیلے پن کا علاج اس نے ڈھونڈ لیا تھا اس نے ایک دو کمرے اپنے استعمال کرنے کے لئے رکھ چھوڑے تھے اور باقی تمام کمرے مختلف قسم کے لوگوں کو کرایہ پر اس لیے دے رکھے تھے تاکہ آس پاس چہل

پہل رہے گو مکان میں کالج کے لڑکے۔ بوڑھے بچے بھی رہتے ہیں۔ لیکن جب اُس کے پاس نوجوان عورتیں یا کمسن لڑکیاں ہوتی تھیں تو اسے اپنے اکیلے پن کا احساس بالکل ختم ہو جاتا تھا۔

دینو شاہ کے رنگین مزاج سے سارا شہر بخوبی واقف تھا اس کی جوانی میں خاص طور پر بیوی کے مرنے کے بعد اس کے معاشقوں کے قصے کافی مشہور رہتے تھے۔ وہ خود بھی کبھی کبھی اپنی جوانی کی حکایتیں بڑے مزے سے سنایا کرتا تھا اور یہ قصے مکان میں رہنے والوں کے ساتھ ساتھ محلے والوں کو بھی تفریح کا سامان بن گئے تھے۔

بال سفید ہوتے ہی اس کے فطری تقاضے عمر کے بوجھ تلے دب تو چکے تھے لیکن جب بھی کوئی نوجوان لڑکی یا عورت اس کے سامنے سے گزر جاتی تھی تو وہ اُسے گھور گھور کر ابھی بھی بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کی یہ حرکتیں بھی دیکھنے والوں کو اشتعال دلانے کی بجائے تفریح کے مواقع فراہم کرتی تھیں۔ شرارتی قسم کی لڑکیاں جب جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لیے اس کے سامنے بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتی تھیں تب وہ اپنی خوبصورتی سے تراشی ہوئی سفید مونچھوں کو اپنی کمزور انگلیوں سے سنوار کر تکیہ بغل میں دبوچ کر انہیں ایسے دیکھتا رہتا تھا۔ جیسے کوئی نواب اپنے حرم میں کوئی دلکش رقص دیکھ رہا ہو۔ کبھی کبھار جب وہ اردگرد لوگوں کی کیفیت بھانپ لیتا تو وہ چارپائی سے اتر کر فرش پر ایسے ٹہلنے لگتا جیسے کوئی شہنشاہ

ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے لگا ہو
یہ بھی ایک تفریح کا سامان ہوتا تھا۔

بوڑھے شیر کی طرح جب وہ گرجنے لگتا تو اس کی زبان اُس کے مسوڑوں سے پھسل کر ایسے باہر آنے لگتی جیسے کوئی سانپ سپیرے کی پٹاری سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ اس کے غصے کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن مکان میں رہنے والے کالج کے لڑکے لڑکیاں صرف اُسے چڑھانے کی غرض سے اُسے سُناتے ہوئے ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کرتے "سُنا ہے امریکہ میں سو سال کے بوڑھوں کو بھی شادی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی پچاس سالہ میم مل جاتی ہے۔ لیکن یہاں کے بوڑھوں کو تیس سال کی دلہن بھی مل جاتی ہے۔ کہو کالیں پھر مہورت ا"

یہ معنی خیز مکالمے سن کر ستر سالہ دینو شاہ ان کو کبھی مکان سے باہر نکلنے کی دھمکی دیتا تھا اور کبھی ان کے مذاق سے لطف اندوز ہو کر مکان یا کمروں کی مرمت وغیرہ کا کام فوراً کروا دیتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اُن کے بچوں کو مٹھائی کے لئے موٹی موٹی رقم بھی دیتا تھا۔ اس کے کرایہ دار اس کی کسی بات کا کبھی بُرا نہیں مانتے تھے۔ لیکن جب سے دینو شاہ نے اپنا ایک کمرہ گوبند کو کرایہ پر دے دیا تو گویا ساری عمارت میں زلزلہ آگیا۔

گوبند کمرے میں اکیلا نہیں رہتا تھا اس کے ساتھ اُس کے

بچے بھی تھے اور خوبصورت بیوی بملا بھی ان کے بارے
میں کرایہ دار ہی نہیں بلکہ محلے کے سب ہی لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے
تھے اور دینو شاہ کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ حالانکہ
مکان میں اور بھی حسین عورتیں رہتی تھیں لیکن بملا کی طرف بڑھتی ہوئی
دینو شاہ کی توجہ زیادہ دیر چھپ نہیں سکی تھی۔

شکل و صورت سے بملا بھولی بھالی تھی۔ محلے کے کئی گھروں میں
جا کر وہ برتن صاف کرتی تھی۔ کپڑے دھوتی تھی اور گھریلو قسم کے اور
بھی چھوٹے چھوٹے کام کرتی رہتی تھی مگر جب سے وہ دینو شاہ کے
مکان میں رہنے لگی تھی دینو شاہ نے اپنے بوڑھے نوکر کو نکال دیا تھا
اور بملا ہی دینو شاہ کے سارے کام کرتی تھی۔ ایک بار کمرے میں داخل
ہو کر وہ دن ڈھلے تک وہاں سے نکلتی نہیں تھی۔ گوبند خود دن بھر
مچھلیاں پکڑتا رہتا اور شام کو ریڑھی لگا کر تلی ہوئی مچھلیاں بیچتا
رہتا تھا اور گئی رات گھر لوٹتا تھا۔ بچے دن بھر اسکول میں رہتے
تھے اور گھر میں ان کی بڑی لڑکی راددھا رہتی تھی۔ وہ بھی صحن میں
میز لگا کر محلے والوں کے دُھلے ہوئے کپڑوں پر استری کرتی رہتی
تھی۔ یوں بملا کو تقریباً سارا دن دینو شاہ کے کمرے میں
گزارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ حقیقت تمام کرایہ دار بخوبی
جانتے تھے۔ بملا کی عمر یوں تو تئیس سال سے زیادہ نہیں۔ لیکن گاؤں
کی اس صحت مند عورت کا چہرہ و جسم بناوٹ کے بغیر ہی پرکشش ہے۔

اس کے سادہ بدن سے جھانکتے ہوئے نسوانی وقار میں بھی کسی قسم کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔ دینو شاہ کی مرحوم بیوی کے چند پرانے کپڑے پہن کر کملا کا روپ اور بھی نکھر آیا تھا۔ اور اس تبدیلی کے ساتھ لوگ مشکوک نظروں سے کملا اور دینو شاہ کے ساتھ ساتھ گوبند کو بھی دیکھنے لگے تھے۔ کیوں کہ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا کر دیتا تھا اور اس سے سارے محلّے میں تشویش پھیل گئی تھی۔

ہر رات گوبند کی کھردری آواز اور گالی گلوچ محلّے والوں کو بیدار کرتی تھی اور پھر کملا کی چیخ و پکار۔ بچوں کی آہ و بکا کے ساتھ دینو شاہ کی لوٹکا لوٹکی محلّے والوں کی نیند حرام کرنے لگی تھی پہلے پہل تو مکان میں رہنے والے دوسرے کرایہ دار یا گاہے بگاہے محلّے والے بھی بیچ بچاؤ کے لئے دوڑ پڑتے تھے۔ لیکن بعد میں دینو شاہ کی ضد کی وجہ سے یہ ناگوار شور غل برداشت کرنے کے ویسے ہی عادی ہو گئے جیسے کسی بڑے اسٹیشن کے پڑوس میں رہنے والے لوگ رات کی چیرتی ہوئی ریل کے انجن کی چیخ اور لگاتار پہیوں کی گڑگڑاہٹ کے عادی ہو جاتے ہیں۔

گوبند کے تین چھوٹے چھوٹے لڑکے یوں تو ان ہنگاموں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی کبھی کبھار جب گہری نیند سے بیدار ہو کر اپنی اشک بار آنکھوں کو موند کر رونا شروع کرتے تو گوبند

اور بملا ان کی معصومیت کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے پر وار کرتے رہتے تھے جیسے ایک سانپ اور نیولا لڑ رہے ہوں۔

تین چار جھڑپوں کے بعد گوبند گالیاں بکتا ہوا تقریباً روز ہی برآمدے میں جا کر چارپائی بچھائے کروٹیں بدلنا شروع کرتا تھا اور بملا رات بھر سسکتی رہتی تھی۔ بچے تو خیر نا سمجھ تھے فوراً جنگ بندی ہوتے ہی آرام سے سو جاتے تھے۔ لیکن پندرہ سالہ رادھا اپنے ماں باپ کی تکرار کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اور دن رات سوچ میں ڈوبی رہتی تھی۔

صبح ہوتے ہی گھر میں مکمل خاموشی چھا جاتی تھی اور پھر یہ تبدیلی دیکھ کر محلے والے حیران تھے۔

گوبند کو تو ویسے بھی محلے میں کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک تو وہ بدصورت تھا اور پھر بد دماغ بھی۔ اس کے روز روز کے ہنگاموں سے وہ اور بھی تنگ آ چکے تھے۔ اس لئے گوبند کو محلے سے نکلوانے کے لیے انھوں نے کتنے ہی جتن کئے۔ لیکن دینو شاہ کسی بھی قیمت پر گوبند کو اپنے مکان سے نکال دینے کے حق میں نہ تھا۔ حالانکہ سبھی جانتے تھے کہ دینو شاہ اس قسم کے ہنگامے تو کیا کبھی کبھی بچوں کی چیخ و پکار بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

دینو شاہ کو شروع سے ہی گوبند سے نفرت تھی۔ لیکن وہ سب فقط بملا کے لئے برداشت کر رہا تھا۔ کمرے کا کرایہ نہیں۔ بجلی

فیس نہیں یہ تمام سہولتیں دینو شاہ گو بند کو نہیں بلکہ بملا کو دیتا تھا
سردیوں کی صبح جب بملا دینو شاہ کے اشارے کے ساتھ ہی ایک
پالتو بلی کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو چند پڑوسیوں
کا شک یقین میں بدل گیا اور وہ چشم دید گواہ بن کر اس بات کی تصدیق
کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے کہ دینو شاہ نے بملا کو اپنی رکھیل بنا کر رکھا
ہوا ہے لیکن ہنگامہ صرف رات کو ہوتا ہے دن کو نہیں یہ بات کسی کی
سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اِن ہی دنوں گو بند کی لڑکی رادھا نے ایک روز جب اپنی
ماں کو دینو شاہ کے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرتے
دیکھا تو وہ بھی بند دروازے سے چپک کر دونوں کی گفتگو سننے لگی۔
ایک ایک لفظ اس کے نابالغ ذہن کو چونکاتا رہا اور اس کے سانسوں
کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ کم عمری اور ناسمجھی کی وجہ سے وہ الفاظ کا مفہوم
سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ گویا وہ ماں کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ
کو یوں کریدتی رہی جیسے کسی پتھر سے ریت کے ذرّے۔ اور پھر
رات ہوتے ہی سر درد کا بہانہ بنا کر گو بند کی آمد سے پہلے ہی برآمدے
میں چارپائی بچھا کر سو گئی۔ اس رات کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

اس غیر متوقع مگر خوشگوار تبدیلی نے سارے محلے والوں کو
چونکا دیا۔ پھر جب دوسری رات بھی خاموشی سے گزر گئی تو
لوگوں نے یہی اندازہ لگایا کہ دینو شاہ نے گو بند کا مُنہ سکوں

سے بند کر دیا اس کے بعد تاریک راتیں خاموشی سے گذرتی گئیں
اور رفتہ رفتہ لوگ بھول ہی گئے کہ گوبند اور بملا کا کبھی جھگڑا
ہوا کرتا تھا۔ تقریباً چار مہینے کے بعد سارے محلے میں ایک بار
پھر تشویش پھیل گئی تھی۔

محلے والے ایک ایک کر کے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں
جمع ہو رہے تھے اور جب دینو شاہ کو پولیس نے طلب کیا تو اس پر
واقعات کی تفصیل سنتے ہی بجلی گر پڑی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے
سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ جب منہ لٹکائے ایس ایچ۔ او صاحب
کے کمرے میں داخل ہوا تب بملا کا بیان قلمبند ہو رہا تھا۔

بملا کا ہر لفظ سسکیوں و ہچکیوں میں ڈوبا جا رہا تھا اور اس
کے بیان کا ایک ایک لفظ جہاں گوبند پر آگ برسائے جا رہا تھا
وہاں دینو شاہ کو بھی برقی کے جھٹکوں کی مانند ہلا رہا تھا۔ گوبند
بملا اور دینو شاہ تینوں ایسے تڑپ رہے تھے جیسے وہ دلدل میں
دھنسے جا رہے تھے جب کہ رادھا کمرے کے ایک کونے میں ایک
سوالیہ نشان کی طرح کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کھڑے
لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کپڑے گیلے تھے اور اس کے جسم
کے ساتھ چپک گئے تھے۔ بکھرے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپ
ٹپ کر یوں گر رہے تھے جیسے وہ اس کے حال پر ایک ہمدرد چشم دید
گواہ کی طرح حالات کی ستم ظریفی پر آنسو بہائے جا رہے تھے۔ آس پاس

کھڑے لوگ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے نمائش گاہ میں رکھا ہوا عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔

" یہ سب کیا ہے " دینو شاہ کی ٹوٹی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ایک وقفے کے لیے حاضرین اس کے چہرے کو دیکھتے رہے اور خاموشی چھا گئی جو لوگ کچھ کہنا بھی چاہتے تھے وہ بھی مشکوک نظروں سے دینو شاہ کو دیکھنے لگے۔

" رادھا کو پولیس نے آج صبح گرفتار کیا ہے شاہ جی "

ایس۔ ایچ۔ او صاحب نے قلم میز پر رکھ کر کہا " رادھا خودکشی کرنا چاہتی تھی اور اس نے اقبالِ جرم کے ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ ماں بننے والی ہے کنواری ماں !! اس غفلت کے ذمہ دار اس کے والدین ہیں شاہ جی ! انھوں نے چند رنگین راتیں بسر کرنے کی خاطر راستے کا کانٹا تو صاف کر دیا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ ایک کمسن معصوم ۱۵ سالہ لڑکی سرد راتوں میں برآمدے میں تنہا سو کر کسی بھی جنس زدہ وحشی کی ہوس کا شکار ہو سکتی ہے۔ رادھا اپنے ماں باپ کی خاطر قربان ہو گئی۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ماں باپ کے جھگڑے کبھی ختم نہ ہو پاتے۔ ایس۔ ایچ او نے جب اپنی مختصر تقریر ختم کر دی تو گوبند کو ایسا لگا جیسے وہ ایک اونچی چوٹی سے گر کر نوکیلے پتھروں سے ٹکراتا ہوا ایک کھائی کی گہرائی میں ڈوبا جا رہا ہو۔

محلے والے کہانی کی تہہ تک پہنچ گئے تھے اور دینو شاہ کو

مشکوک و نفرت بھری نگاہوں سے گھورتے رہے۔

"درندہ!" کسی نے زیر لب کہا اور یہ لفظ سنتے ہی دینو شاہ چیخ پڑا اور زار زار رو کر فرش پر بکھرے کاغذ کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا جو ہوا کے جھونکوں سے اڑنے لگے تھے۔

لوگوں کی مشکوک نظریں جب سوالیہ نشان بن گئیں تب دینو شاہ اپنی طوطلی زبان میں کہنے لگا۔

"ہاں ہاں درندہ! آج بیس سال کے بعد میں اپنی مرحومہ بیٹی کی تحریر سمجھ سکا۔ اس نے بھی یہی لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ تو بھابی کی غفلت یا بھائی کی لاپرواہی ہو سکتی تھی۔ لیکن ہملا تو ماں ہے۔ پھر یہ سب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ میرا بیٹا بھی رنگین راتوں کا سحر دیکھتے دیکھتے اپنی بن ماں کی بہن کو بھول گیا تھا اور وہ یوں پڑی رہی جیسے وحشی درندوں کے سامنے شکار اس کم بخت جیسی نوکرنے بھی میری معصوم بیٹی کو ایسے ہی " اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اس کی زبان رک گئی اور وہ رادھا کو دیکھنے لگا اس کی کے دل سے ایک ہوک اٹھی اور یوں لگا جیسے اس کی بیٹی کی تحریر ایک تصویر بن کر اسے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے وہی الفاظ دہرانے لگی ہو جیسی نوکر درندہ ہے۔ اسے کچل ڈالو یا پکڑ لو، اس معنی خیز جملے کا مطلب وہ بیس سال کے بعد سمجھ گیا تھا۔ اور وہ اپنے تھراتے تھراتے ہونٹوں پر مشکل سے قابو پا کر ہملا کو تسلیاں دینے لگا۔

"جب میری آنکھوں میں تیز بینائی تھی تب چمک دمک نے یوں گھیر لیا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا اب جب کہ میری بینائی کمزور ہے مجھے سب کچھ نظر آنے لگا ہے میں جبشی کو نہ پکڑ سکا اور نہ ہی اُسے کچل سکا۔ لیکن اس شخص کو ضرور تلاش کروں گا جو رادھا کو مسل کر بھاگ گیا ہے" یہ کہتے ہی دیو شاہ غصّے سے لال ہو گیا۔ بلاتے آنسو پونچھ لئے اور رادھا کو گلے سے لگا کر ملتجی نظروں سے دیو شاہ کو دیکھتی رہی۔

دیو شاہ اس کا حقیقی باپ نہ سہی لیکن باپ جیسا اسکو ضرور کرتا تھا۔ اور اُسے اکثر اپنی مرحومہ بیٹی کے نام سے پکار کر اپنے کلیجے کی آگ کو ٹھنڈا کیا کرتا تھا۔

وہ یونیورسٹی کی قابل ترین پروفیسر ہے۔ لیکن اُس کے اطوار وانداز نرالے ہیں۔ جب دیکھو بے رونق چہرہ۔ بے ترتیب بال۔ بدن پر ڈھیلے ڈھالے کھادی کے کپڑے۔ ہاتھ میں وزنی کتابیں لئے کھوئی کھوئی رہتی ہے۔ خدا جانے یہ جذبات کی کشمکش ہے یا خیالات کی گھٹن۔ لیکن اُس کا حلیہ دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آجاتی سنجیدگی نے اُس کے چہرے کے تاثرات کو مفلوج کرکے اُسے پتھر کی ایک مورت بنایا ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی رہتی ہے۔ کلاس روم کے سوا وہ شاید ہی کسی سے بات کرتی ہے۔ اس کا رہن سہن بالکل عام لوگوں سے مختلف ہے۔ آس پاس کے ماحول۔ رسم ورواج سے کنارہ کشی اختیار کرکے ایک چھوٹے

سے کمرے میں موٹی موٹی کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی ہے۔ یہی اس
کا محبوب مشغلہ ہے اور روزمرہ کی زندگی بھی کبھی کبھی رات کی تنہائیوں
میں وہ اپنے تان پورا کو گلے سے لگا کر ساز چھیڑتی ہے یا پھر ساز کے ساتھ
آواز کو ہم آہنگ کر کے گاتی بھی ہے۔ اُس کی آواز میں کتنا سوز ہے۔
الفاظ میں کتنا درد۔ اُس کا طرز بیان ہی ایک فریاد ہے۔ آس پاس کے
لوگوں کو اس ساز و آواز کے ساتھ اکثر سسکنے کی آواز بھی سُنائی
دیتی ہے۔ وہ لوگ اِسے کوئی رُوحانی عمل سمجھتے ہیں۔ شاید یہ تڑپ
ہی اس کی تپسیا ہے۔ سسکتا ہی بھگتی ہے۔ جبھی تو لوگ اسے ڈاکٹر
چنچل شرما کی بجائے "میرا جوگن" کہتے ہیں۔ کوئی اُسے دانشور بھی
کہتا ہے۔ کوئی مُفکر لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ ایک خدادوست
پاک باطن خاتون ہے۔ ایک ملند پایہ زاہدہ!

یونیورسٹی میں وہ پچھلے دس سال سے کام کرتی ہے۔ لیکن آج
تک کوئی نہیں جانتا ہے وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ اس کا
کوئی اور بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کسی سے
ذکر کرتی ہے۔ جہاں سے بھی گذرتی ہے جیسے نمائش کے لیے ایک چلتا
پھرتا تابوت ہو، شاید ہی کسی نے اُسے ہنستے یا مُسکراتے دیکھا ہو۔
لیکن آج اُس کے چہرے پر مسرت رقص کر رہی ہے۔ پتھر جیسے ہونٹوں
پر تبسم ہے۔ آنکھوں میں چمک۔ وہ اونچی ہیل کی سینڈل پہن کر مٹک
مٹک کر ایسے چل رہی ہے۔ جیسے ایک تتلی ایک پُر بہار گلستان

میں گملوں کو چوم چوم کر خوشی سے جھوم جھوم کر اڑتی پھرتی ہو۔

شاید اسی لئے آس پاس کی ہر مشکوک نظر اسے آج جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے۔ ہر دیوار کے پیچھے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن وہ آس پاس کے ماحول سے بے فکر ہو کر ہلکے سُروں میں گنگناتے بہت چاؤ سے اپنے کمرے کو سجا رہی ہے۔

یوں تو اُس کا کمرہ مختلف کتابوں۔ رسالوں۔ کاغذات کے پلندوں سے بھرا پڑا رہتا ہے۔ لیکن آج یہی کمرہ ایک مصوّر کی آرٹ گیلری کی طرح سجا ہوا ہے فرش پر دل کش کشمیری قالین۔ ویلویٹ کے زرق برق کرتے ہوئے موقے اعلیٰ ڈیزائن کے خوبصورت پردے۔ کمرے کے ایک کونے میں وینس کا قدِ آدم مجسمہ اور دیوار پر ایک پُرکشش کینواس۔ خدا جانے آج تک یہ سبھی چیزیں اُس نے کہاں چھپا رکھیں تھیں۔ سوہنی اور مہیوال کی اس تصویر کو اپنی ساڑھی کے پلّو سے صاف کرتے ہوئے نہ جانے اُس کے ہاتھ کیوں کانپنے لگے جیسے کسی اجنبی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ حسرت بھری نگاہوں سے تصویر کی گہرائیاں ناپتے ہوئے اچانک اس کے کانوں میں ایک مدھر سُر گونجنے لگا جیسے کوئی پیغام تھا جو اُس کے تھرتھراتے لبوں کو نغمہ بردل چھیڑنے کے لئے اکسانے لگا تھا۔

اس کا دل دھڑکنے لگا اور دل کی دھڑکن کے ساتھ ساز بجتے رہے۔ وہ تصویر کے رنگوں میں کچھ ڈھونڈتی رہی۔ کچھ سمجھتی رہی۔ کچھ محسوس کرتی رہی ساز میں پیار تھا۔ محبت تھی رنگوں میں محبوب تھا، محبوبہ تھی۔ اس کے جسم میں گدگدی ہونے لگی۔ اپنے ٹھنڈے جسم میں کسی ان دیکھی

آگ کی ہلکی ہلکی آنچ کی تپش سے رگ رگ میں حرارت محسوس کرتے ہی اُس کی آنکھوں سے نشہ چھلکنے لگا اور وہ ایک الھڑ دوشیزہ کی طرح صوفے پر دراز ہو کر انگڑائیاں لینے لگی جیسے ایک نازک غنچہ کھلنے کے لیے بیتاب تھا یا کسی کو چھونے کے لیے بے قرار۔ اچانک اپنے جسم سے ایک ایک کپڑا اتارتے ہوئے اسے اپنے مایۂ نازکردار سے نفرت ہونے لگی۔ نفرت کے اس احساس کے ساتھ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دلدل سے نکل کر ایک وسیع میدان میں ایک ہرنی کی طرح دوڑتی جا رہی ہو۔ لاوے جیسے شدّت لیے وہ اپنی موٹی موٹی کتابوں کو ٹھوکریں مارتے ہوئے اپنے لباس کو فرش پر مسل کر باتھ روم میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عُریاں جسم کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔ موتی جیسے پانی کے قطروں کو اپنے بدن پر پھسلتے دیکھ کر وہ شاور کے جھرنے کے نیچے مورنی کی طرح ناچتی رہی اور کوئل کی طرح گاتی رہی۔

میک اپ سے اُسے اتنی نفرت ہے کہ یونیورسٹی کی لڑکیاں بھی اُس کی موجودگی میں اپنے ہلکے سے ہلکے میک اپ کو چھپاتی رہتی ہیں۔ لیکن آج اُس کے ڈریسنگ ٹیبل پر اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے کریم پاؤڈر تیل۔ سینٹ اور لپ اسٹک ہیں۔ وہ بار بار اپنے بالوں کے اسٹائل۔ آنکھوں کے کاجل۔ ماتھے کی بندیا۔ گالوں کی سرخی۔ ہونٹوں کی لالی۔ کانوں کے آویزے دیکھ دیکھ کر مسرور نظر آرہی ہے۔ ایک جدید ڈیزائن کا مٹّی یلا وزیبن کر جب اُس نے ایک خوبصورت سا ہار گلے میں ڈالا تو ذرا جھک کر اُسے

ایسے محسوس ہوا جیسے وہ ہار اُس کے نیم عریاں سینے کے اُبھار سے ٹکرا کر ویسے ہی مچل رہا ہو۔ جیسے سنگ مرمر کی چٹانوں سے ٹکراتا ہوا ایک دلکش آبشار۔ شفان کی سُرخ رنگ کی ساڑی پہن کردہ ساڑی کی پُرکشش گلکاری انگور کے گچھوں کے مانند جھالر کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگی جیسے ایک دُلہن۔ اس کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ اس کی بند پلکوں کے سامنے سفید گھوڑی پر سوار ہوکر وہی پریوں کا راجہ اُسے دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کی ماں اُسے بچپن میں کہانیاں سُنایا کرتی تھی۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے پردے کو ہٹاتے ہوئے وہ چور نگاہوں سے دور دور تک پھیلی ہوئی ایک جھیل کو دیکھنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر اُس کا دل مچلنے لگا۔ پانی کی سطح کو چومتی ہوئی کناروں پہ پھولوں کی قطاروں کو دیکھ کر اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ صاف اور شفاف پانی میں کسی عریاں اپسرا کو غوطے لگاتے دیکھ کر اس کا بدن ٹوٹنے لگا۔ اچانک اُس کی نظریں یونانی دیوتاؤں جیسے ایک شخص پہ رُک گئیں۔ وہ ایک کشتی چلا رہا تھا اور کشتی کا رُخ اُسی طرف تھا۔ جہاں وہ عورت نہا رہی تھی۔ اس کی سانسیں اور بھی تیز ہونے لگیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے شرماتے ہوئے سوچتی رہی۔ آخر احساسات وجذبات کا گنجینہ لے کر پیار ومحبت کی باتیں۔ زندگی و زندہ دلی کی باتیں۔ کہاں سے شروع کرے اور کہاں ختم۔ اگلے ہی لمحے جوتوں کی آواز قدموں کی

آہٹ اور پردے کی جنبش کے ساتھ ایک جانی پہچانی آواز سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ سانسوں کی رفتار بے قابو ہو گئی اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ لب تھرتھرانے لگے اور وہ پردہ ہٹاتے ہی پروفیسر آنند ورما کے بدن کے ساتھ ایسے لپٹ گئی جیسے دو بچھڑے دل ایک مدت کے بعد ملے ہوں۔ کسی کی گرم گرم سانسوں کو اتنا قریب سے محسوس کرتے ہوئے چالیس سال کی عمر میں آج پہلی بار اسے شدت سے ایک عورت ہونے کا احساس ہوتا رہا۔ جیسے وہ ایک انجانی آگ کی گرمی سے موم کی طرح پگھل کر آنند کے قدموں پر گر رہی تھی اور شاید پروفیسر آنند اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا۔

سگرٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے کافی کی گرم گرم چسکیاں لیتے ہوئے وہ پُر معنی نظروں سے اس کے بدلے تیور اور بدلے لباس کو دیکھتا رہا۔ اس کے عجیب اندازِ بیان کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا جیسے کہ وہ اپنی ہر ادا سے اپنے دل کا زخم دکھاتی رہی آنکھوں آنکھوں سے دل کا درد بتاتی رہی اور سرگوشیوں میں اپنا حالِ دل سناتی رہی۔ "چنچل تمہیں یہ اکیلا پن ڈس رہا ہے سادھوسنتوں کی ٹولی سے فرار ہو کر شادی کر لو"۔ پروفیسر آنند نے ایک لمحہ کی خاموشی کو توڑ کر کہا۔ شادی کا نام سنتے ہی وہ خوشی سے چیخ پڑی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بینا کے تار خود بخود بج رہے ہوں۔ سوہنی اور مہیوال بے جان کیتوا اس

چھوڑ کر اس کے ساتھ ناچنے لگے ہوں۔ فضا میں پھلجھڑیاں چھوٹنے لگی ہوں اور بینڈ باجے کے ساتھ وہی پریوں کا راجہ بارات لے کر آ رہا ہو —— لیکن اچانک ایک دھماکہ ہوا اور زلزلے سے ایک حسین عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی۔ تار ٹوٹ گئے۔ ساز خاموش ہو گئے اور زور کی آندھی کے ساتھ وہ ایک تنکے کی طرح اُڑتی رہی۔ چیختی رہی۔ چلاتی رہی اور ایک زخمی درندے کی طرح اپنے بال نوچنے لگی اور چہرے کو اپنے ہی ناخنوں سے بے دردی سے کھرچنے لگی۔

پروفیسر آنند کب اور کس وقت چلا گیا تھا وہ نہیں جانتی۔ کرب و اضطراب میں ہر لمحہ گزارتے ہوئے آج پھر سلگتی رات کی تنہائی اسے پھن پھیلائے ناگ کی طرح بار بار ڈستی جا رہی ہے اور وہ دیکھتے ہوئے انگاروں پر رکھے ایک نازک پھول کی طرح جھلس رہی ہے۔ دوسرے دن معمول کی طرح کھادی کے کفن کے نیچے اپنے وجود کو دفن کر کے آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں چڑھائے ہاتھ میں وہی وزنی کتابیں لئے۔ کلاس روم سے نکلتے ہوئے جب پروفیسر آنند نے اُسے معمول کی طرح "چنچل" کے نام سے پکارا تو اُس کے قدم رُک گئے۔ اُس کے دل میں اک ہوک سی اُٹھی اور وہ آہ بھر کر آہستہ سے کہنے لگی۔

"پروفیسر آنند! آپ یونیورسٹی میں نئے نئے آئے ہیں اس لئے شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ یہاں کا ہر طالب علم۔ پروفیسر

کلرک - چپراسی ڈرائیور ہی کیا شہر کا بچّہ بچّہ مجھے جوگن کہتا ہے - آپ بھی آئندہ ـــــ "

اُس کی آواز ٹوٹ گئی - آنسو کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے جب اُس نے ٹائیلیٹ کا دروازہ بند کیا تو سامنے لگے ہوئے ایک چھوٹے سے آئینے میں اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنا سیاہ رنگ - چہرے پر چیچک کے داغ - موٹی - بھدّی ناک - پژمردہ پچکے گال حبشیوں جیسے بے ترتیب بال دیکھ کر وہ چیخ پڑی -

ابھی بہت سویرا ہے۔ کھڑکی ادھ کھلی ہے اور میں بستر پر نیم دراز
سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے، کبھی کونے میں رکھے سنگ مرمر
کے خوب صورت مجسمے کو دیکھتا ہوں اور کبھی آتش دان سے اُٹھتی
ہوئی دھوئیں کی لکیروں کو   باہر برف گر رہی ہے۔ ہلکی ہلکی
خاموش خاموش، گویا کوئی دل شکستہ چُپکے چُپکے آنسو بہا رہی ہو۔
آس پاس برف ہی برف کی چادر پر چند قدموں کے نشان ہیں اور
میں ابھی ابھی گھر لوٹا ہوں۔ تھکا ہارا! سردی سے ٹھٹھرتا! میرے
دانت بج رہے ہیں۔ اور میں ٹھٹھرتے ہاتھوں سے آتش دان
کی ادھ جلی لکڑی ہلاتا ہوں۔ آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور راکھ کے
نیچے چھپے ہوئے سلگتے ہی انگارے گذرے حادثوں کی طرح ٹمٹمی

لگائے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ چنگاریاں شعلے بن کر میرے احساسات وجذبات کو چھونے لگی ہیں اور مجھے بیتی باتیں یاد آرہی ہیں ــــــ

اُس روز بھی ایسے ہی برف گر رہی تھی۔ گلمرگ کے ہائی لینڈ ہوٹل کے ترلے بار روم میں ایک پُرکشش شام تھی۔ ہر ہاتھ میں جام تھا۔ ساز بج رہا تھا اور رما میری من پسند غزل "ذکر اُس پری وش کا..." گا رہی تھی۔ اُس کی آواز میں سوز تھا۔ بیان میں لطافت، آنکھوں میں نشہ تھا اور اداؤں میں نزاکت۔ پریوں کی طرح مُسکراتی رما کو دیکھتے ہی جب میرے تصور کے دُھندلے دُھندلے خاکے جیتے جاگتے خدوخال میں بدل گئے تو میرا الجھا الجھا دِل ساز اور آواز سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگا تھا، ارمان مچلنے لگے تھے اور زندگی کتنی حسین نظر آئی تھی ــــ گلابی رنگ کی شال میں لپٹے ہوئے اس کے بدن کے قربت کا احساس ایسا تھا جیسے ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات میں آگ کی سہانی آنچ حسن کی دیوی اور نسوانی وِقار کے اس مجسمے کی بناوٹ میں قدرت نے کتنی فنکاری سے کام لیا ہوگا، یہ میں آج بھی سوچ رہا ہوں۔ رما کتنی حسین ہے، کتنی پرکشش ــــ لگتا ہے جیسے قلوپطرہ نے صدیوں بعد مِصر کے صحراؤں کو چھوڑ کر برف کی اِن وادیوں میں جنم لیا ہو ــــــ

پہلی بار جب میں نے اُس کی نیلی نیلی، جھیل سی گہری آنکھوں میں دیکھا تھا تو زندگی صبح کی کرنوں کی طرح مجھ سے آنکھ مچولی کھیلنے لگی تھی۔ دوسری بار میرے کمرے میں مدھم روشنی تھی اور رما کے

کے قدموں کی آہٹ میرے دل کے ہر گوشے میں گدگدی کرنے لگی تھی۔
تیسری بار اس کی پایل کی جھنکار سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں
تھیں اور اس سے لپٹ کر ایسا لگا تھا جیسے کسی صحرا میں مدتوں بعد
دو بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو رہا ہو ـــــ پھر رفتہ رفتہ رما میرے
دل میں تمنّا کے ایک غنچہ کی طرح آہستہ آہستہ کھلتی رہی اور میری بیوی
للیتا خزاں آلودہ پتّے کی طرح میری زندگی سے الگ ہوتی گئی۔ لیکن محبت
کا وہی پھول دیکھتے ہی دیکھتے دہکتے ہوئے انگاروں پر رکھے ایک
نازک پھول کی طرح جھلس کر راکھ ہوتا جا رہا ہے ---- اور ہوا کا ہر
جھونکا راکھ کی تہہ کو مجھ سے الگ کر کے نہ جانے کہاں لے جاتا ہے!
رما میری داشتہ نہیں ہے ـــــ ملک کی یہ نامور رقاصہ
میری بیوی ہے۔ لیکن اس کے چاہنے والوں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی
چاند کے گرد ستاروں کی۔ اس کے پاس عزت ہے، دولت ہے،
شہرت ہے، لیکن نہ چاہت کا جذبہ ہے اور نہ ہی شادی کا بندھن!
وہ اکثر گھر سے تو کیا شہر سے باہر رہتی ہے۔ کبھی کبھی ملک سے بھی باہر
رہتی ہے اور میں اِس محل نما مکان کی چاردیواری میں ماضی کا صدمہ
لیے اپنے مستقبل کا ماتم کرتا رہتا ہوں۔ سگریٹ کا زہریلا دھواں
پھونک پھونک کر دن کاٹتا ہوں اور شراب کے تلخ گھونٹ پی پی کر
راتیں گزارتا ہوں۔
سکون کی تلاش میں ہوش و حواس قائم رکھنے کے لئے نازیبا

حرکتیں کرتا ہوں لیکن پھر بھی نہ چین ہے اور نہ قرار! فقط جذبات کی شدّت ہے، احساسات کی گھٹن ہے اور خیالات کی کش مکش ہے۔

رماپور سے تین مہینے کے بعد گھر لوٹی تو ہے لیکن وہ کل بھی رات گئے یہاں آئی ہے اور اس وقت میرے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے دُور ہے۔ نہ رشتہ ہے نہ بندھن ہے۔ فقط ہمارے درمیان ایک دراڑ ہے جو رفتہ رفتہ ایک کھائی بنتی جا رہی ہے۔ تبھی تو میں نے آج بھی آدھی رات سگریٹ کی راکھ جھاڑتے، چٹکیاں بجاتے گزاری ہے اور باقی آدھی رات پہاڑی کے دامن میں برف کی تہیں اُٹھاتے ہوئے دیواروں پر آویزاں تصویروں کو توڑا۔ ادھ جلی لکڑی سے آس پاس کی ہر خوبصورت چیز کو مسمار کر دیا۔ لیکن پھر بھی رما نے نہ شیشوں کے ٹوٹنے کی آواز سُنی اور نہ ہی میرے ٹوٹے دِل سے نکلی کراہوں کو ——— بس بستر پر ایسے لیٹی رہی گویا ایک ناگن ڈسنے کے بعد لُٹ گئی ہو۔

وہ کس کے ساتھ آئی۔ کہاں سے آئی۔ وہاں محفل موسیقی تھی، محفلِ یاراں تھی، مے کشی تھی یا دل لگی تھی۔ یہ میں روز ہی پوچھنا چاہتا تو ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ حال پوچھوں یا حالت دیکھوں۔ وہی لڑکھڑاتے قدم، سہارے کا محتاج نیم عریاں بدن اور ایک کچلے ہوئے پھول کی مانند چہرہ۔ بے دردی سے دبوچا ہوا جسم، جس کو جب بھی چھو لیتا ہوں تو وہ ایسے چلاتی ہے جیسے میں نے

کسی پھوڑے نوکیلے نیزے سے چھیڑا ہو۔

کل میں کبھی رات گئے گھر لوٹا۔ دِن بھر بس چلتا ہی رہا۔ کبھی اِس پہاڑی پر اور کبھی اِس پہاڑی پر چکوروں کو اُڑاتا پھرا۔ یہ میرا مشغلہ نہیں ہے بلکہ دن کاٹنے کا ایک بہانہ ہے۔ نہیں تو دن کٹے بھی کیسے؟ یوں بھی دن میں چھ سات دفعہ نہاتا ہوں۔ نو دس بار کپڑے بدلتا ہوں۔

کبھی برف کے بت بناتا ہوں اور کبھی خود ہی بُت کی طرح برف کے ڈھیر کو دیکھتا ہوں۔ برف سے ڈھکے مکان، درخت اور پہاڑیاں دیکھتا رہتا ہوں یا پھر برف کی تہیں اُٹھاتا رہتا ہوں۔ کل بھی میں کوئی ایسی ہی احمقانہ حرکت کر رہا تھا کہ کسی کی سرگوشیوں نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اور سفید لباس پہنے ایک عورت سامنے سے گزر گئی۔ صورت جانی پہچانی تھی لیکن للیتا چھ مہینے کے بعد کیا لوٹ کر آ سکتی ہے؟ ——— وہ تو گونگی تھی، بہری تھی، بدذوق تھی، پھر یہ ہلکے ہلکے سروں میں کون گنگنا رہا ہے۔ شاید رما میری تلاش میں بھٹک رہی ہوگی ——— برف کی تہیں ہٹاتے میں یہی سوچ رہا تھا کہ کسی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً بندوق کا گھوڑا دبایا اور اس غریب کو ابدی نیند سُلا دیا۔ سفید سفید برف کی چادر پر سرخ لہو کے داغ دیکھتے ہی میرے احساسات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گویا میرے سامنے خون میں

لت پت ایک لاش کو ڈھانپتی ہوئی ایک سفید چادر تھی۔ اور چادر کے نیچے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔ میرے ہاتھ سے بندوق گر گئی دل سے اک ہوک اُٹھی اور میں اپنی وحشیانہ حرکت پر نادم ہوا۔ میری نظریں جب گُنیتا کے پھٹے ہوئے پیٹ پر رک گئیں تو میں چیخ پڑا ——— وہ ماں بننے والی تھی۔ للیتا بھی ماں بننے والی تھی ! ——— اور میں باپ !! برف سے ڈھکی ہوئی ایک درخت کی ٹہنی جب ٹوٹ کر گر گئی تو مجھے ایسا لگا جیسے ایک باپ اپنے بچے کے کفن کو چوم کر چیخ پڑا ہو ——— میں بھی چیخ پڑا۔ راہ گیر مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے رہتے۔ نوکر لوگ دوڑتے بھاگتے میرے پاس آ گئے۔ لیکن میں بھاگتا رہا، چیختا رہا، چلاتا رہا۔ کانپتے ہوئے ہانپتے ہوئے پہاڑی کے دامن میں برف کی تہیں اٹھاتا رہا۔ لیکن وہاں نہ ماں ملی اور نہ اس کا بچہ، نہ بیوی ملی اور نہ ہی بیٹی، نہ دوست ملی اور نہ ہی محبوبہ۔ وہاں فقط برف تھی ——— پھر جب گھر پہنچا تو وہاں فقط نوکر تھے اور میرے کمرے میں سنگ مرمر کا ایک بت تھا ——— چیختا چلاتا، دوڑتا بھاگتا میں گھر گھر رما کی تلاش کرتا رہا۔ کبھی ٹی۔ وی۔ سینٹر، کبھی ریڈیو اسٹیشن، کبھی رحمان خاں کے گھر ....

کبھی رقاص گوپی کرشن کے گھر، کبھی کیپٹن کول کے گھر، کبھی اُستاد شاکر خاں کے گھر لیکن رما کہیں نہ ملی ——— پھر جب میں نے ڈاکٹر درکا دروازہ کھولا تو مجھ پر بجلی گر گئی۔ ڈاکٹر در کمرے کے باہر آ چکا

تھا اور رما کمرے کے اندر کپڑے پہن رہی تھی۔ خدا جانے اُس نے مجھے دیکھا یا نہیں لیکن میں ایک سائے کی طرح اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ ڈی لکس بار میں اس نے کاونٹر پر بیٹھے بیٹھے تین چار پیگ پی لئے۔ آس پاس کے لوگوں کو آٹوگراف دئے۔ چاہنے والوں سے ہاتھ ملائے۔ کچھ اپائنمنٹ کئے۔ کلب میں جاکر کتنی ہی باہوں میں جھومتی رہی اور پھر تاریکی میں جانے کہاں کھو گئی۔

آدھی رات کو کسی نے دستک دی تو میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے وہی بدصورت چہرہ تھا جسے دیکھتے ہی مجھے کوفت ہونے لگتی ہے۔ وہی سوکھا سوکھا بدن جس میں نہ محبت کی گرمی تھی اور نہ چاہت کا جذبہ۔ یہ للیتا تھی اور اس کی گود میں میرا بچہ تھا۔ وہ دونوں سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ میں اُنھیں دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ لیکن جونہی انھیں گلے لگایا، برف کا بت ٹوٹ گیا اور میں دھنس گیا اور پھر ان کی تلاش میں چلتا ہی رہا۔

اس وقت میرا کمرہ دھوئیں سے بھر گیا ہے۔ لیکن آگ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ شاید میرا ہی دل چپکے چپکے جل رہا ہے اور رما مجھے پاگل سمجھ کر بجلی کے شاک دلا رہی ہے — لیکن میں پاگل نہیں ہوں۔ میں ایک خونخوار وحشی درندہ ہوں۔ اپنی بیوی کا خونی ہوں! اپنے بچے کا قاتل ہوں!!

مجھے بجلی کے شاک نہیں بلکہ پھانسی کا پھندہ چاہیئے۔ میں ایک

خونی ہوں۔ ایک قاتل ہوں۔ ہاں ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں کہ للیتا گھوڑے سے پھسل کر نہیں مرگئی ہے بلکہ میں نے اپنی بیوی کو بے رحمی سے قتل کر کے اسے منوں برف کے تودوں کے نیچے دفن کیا ہے۔ خدارا کوئی تو مجھے بھی اُسی لحد میں سُلا دے یا پھر رما کے سوئے ہوئے پیار کو جگا دے۔ نہیں تو میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گا۔

رما نے ڈائری کا ورق پڑھ کر شراب کے دو گھونٹ پی لئے اور پھر ڈائری کو تکیے کے نیچے رکھ کر البم کی ورق گردانی کرتی رہی۔ البم میں فقط تین تصویریں تھیں ایک تصویر اس کے کالج کے ساتھی بھوشن کول کی تھی، جس نے اپنے والدین کو ٹھکرا کر اُس کے ساتھ لو میرج کر لی لیکن شادی کے دوسرے دن ہی خود کشی کر لی۔ دوسری تصویر فلموں کے ڈائریکٹر ونود شرما کی تھی۔ وہ اُس کا دوسرا خاوند تھا لیکن اُسے ٹھکرا کر دوسری شادی کر چکا تھا۔ اور تیسری تصویر اُس کی اپنی تھی جسے وہ اپنے چاہنے والوں کو فین میل کے ساتھ بھیجا کرتی تھی۔ البم کو سینے سے لگا کر وہ کھڑکی کھول کر ایک تنہا درخت کو دیکھتی رہی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا اور ڈاکٹر درکی جانی پہچانی آواز سنتے ہی اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اُٹھا۔

رما دیوی! بمبئی سے آپ کی میڈیکل رپورٹ آگئی ہے لیکن مجھے از حد افسوس ہے کہ آپ کا بھارت میں تو کیا دنیا

کے کسی کونے میں اور کسی بھی قیمت پر آپریشن نہیں ہو سکتا مرض پیدائشی ہے اور مجھے حیرت ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ جسمانی تعلقات کے قابل نہیں ہیں آپ بار بار شادی کیوں کر لیتی ہیں ــــــ"

ڈاکٹر در اور بھی کچھ کہتا رہا لیکن رما ملتجی آنکھوں سے ریلویر کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ اچانک چیخ پڑی اور اپنے پُرکشش چہرے اور خوبصورت جسم کو اپنے ناخن سے کھُرچنے لگی۔ اپنے مرمری شانوں پر بکھرے سنہری بالوں کو نوچنے لگی، پھر آنکھیں بند کر کے بوتل کو منہ سے لگا کر غٹا غٹ وہسکی پینے لگی۔ لڑکھڑا کر دیواروں سے ٹکراتی رہی۔ گھنگھرو پہن کر گھنٹوں ناچتی رہی، گاتی رہی، چیختی رہی۔ چلاتی رہی اور اس کا تیسرا خاوند ساتھ والے تنگ و تاریک کمرے میں لوہے کی بیڑیاں بجاتے زور زور سے آوازیں دیتا رہا اور اسے پکارتا رہا۔

اُس روز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سڑک پر معمول کی طرح چہل پہل نہیں تھی۔ میرا سکوٹر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ لیکن ایک جانی پہچانی آواز سنتے ہی میرا پاؤں یکدم بریک پر جم گیا۔

"رمیش تم ۔۔۔ ؟"

"یار ٹیکسی نہیں مل رہی ہے"

"گھر جا رہے ہو نا ۔۔۔"

"کیوں! کیا مجھے کسی کالے کتّے نے کاٹ لیا ہے جو نو بجے ہی گھر چلا جاؤں گا ۔۔۔"

"پھر کہاں جا رہے ہو ؟"

"تم لفٹ دو گے مجھے ؟"

"کیوں نہیں ...... اگر ضروری کام ہو تو ۔"

"ضروری نہیں بلکہ بہت ضروری کام ہے پیر تو بے یار........
پلیز آئل ..... آیلا بچ می ۔"
"بیٹھو .... لیکن جانا کہاں ہے ؟"
"مست محل !"
"کوئی نیا یار ہوگا ؟"
" یار تو آجکل میرے ساتھ ہی رہتا ہے ۔ یہ دیکھو سکاچ کی دو لوتلیں ...... لیکن کمال ہے یار تو مست محل کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا ۔ ارے وہ تو فردوس کا نعم البدل ہے ...... ویسے فردوس یعنی جنت کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کچھ تو سُنا ہی ہوگا ؟"
"سنا ہے لیکن یہ مست محل ......؟
"وہ تو ایک گلستان ہے ، جہاں خوبصورت کلیاں بکتی ہیں ۔ پچاس روپے سے لے کر پانچسو روپے تک ....۔ .... اپنا سودا تو فقط چار سو روپے میں پٹ چکا ہے !"
"چار سو روپے !"
"ہاں ۔ ہاں ...... ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں ہم نے ایک رات میں دو ہزار بھی خرچ کئے ہیں ـــــــ ہاں ! اگر تم چاہو تو تو سودا پچاس روپے میں بھی ہو سکے گا ۔ لیکن باسی پھل مِل سکیں گے ۔

کہو تو تمہارا کام کلی لگے ہاتھوں کرا دوں ؟"

"اتنے سارے روپے تمہارے پاس آتے کہاں سے ہیں ؟"

"روپے آتے نہیں۔ پیدا کئے جاتے ہیں۔"

"لیکن تم تو بیکار رہو ؟"

"کیا بچکانہ سوال ہے...... انل تمہیں معلوم ہے مجھے ایسے بورنگ ڈسکشن سے سخت نفرت ہے.... تم جب بھی ملتے ہو، اپنی تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ تم نہیں جانتے زندگی ایک انمول موتی ہے جس کی قدر کرنی چاہیئے۔ زندگی کتنی حسین ہے یہ تمہیں نہیں معلوم..... زندگی زندہ دلی کا نام ہے اور زندہ دلی کا عورت اور شراب کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دن کو جن، شام کو وہسکی، رات کو عورت، بس..... تم شراب نہیں پیتے، کلب نہیں جاتے، مزے کی بات تو یہ ہے کہ تم آج تک کیبرے دیکھنے بھی نہیں گئے..... آخر تم دن کیسے کاٹتے ہو ؟ راتیں کیسے بتاتے ہو..... اسکوٹر پر بیٹھ کر گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر یہی ہے نا تمہاری زندگی۔ میکنیکل لائف، بورنگ زندگی۔"

"میں نے جس زاویہ سے زندگی کو دیکھا ہے وہ بے حد حسین ہے۔"

"امپاسیبل...... تمہاری یہ ظاہری خوشی تمہارے احساس کمتری کو عیاں کرتی ہے۔

"اور میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے اردگرد فقط کانچ کے چند ٹکڑے ہیں جو تیز روشنی میں چمکتے ضرور ہیں۔ لیکن اندھیرے میں چبھ کر تمہیں زخمی بھی کر سکتے ہیں..... وقت ریت کی طرح تمھاری مٹھی سے نکل رہا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو..... آخر تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

"جنہیں دودھ ملتا ہے وہ گائے خریدنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے..... اچھا تم اسکوٹر کو سنبھالو اور مجھے یہیں اتار دو۔ سالا دلال یہیں کہیں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔

"دلال — ؟"

"جی، ہاں! پمپ (PIMP) دس فیصد کمیشن لیتا ہے۔ اس لئے بتا رہا ہوں شاید کبھی ضرورت پڑ ہی جائے"

"رمیش تم میرے دوست ہو — اپنی ان بری عادتوں سے باز آؤ۔ یہ فضول خرچی ہے۔

"انل میں تمہاری طرح چھ سو روپیہ کا ملازم نہیں ہوں۔ زندگی کی گاڑی سکوں کے پہیوں پر چلتی ہے اور میرے پاس سکوں کی کمی نہیں..... یہ دیکھو نوٹوں کے بنڈل اور چیکس بلینک چیکس ..... جن پر ڈیڈی کے دستخط ہیں جو میرے عیش و آرام کے لئے کافی ہیں"

"ڈیڈی!"

میں چونک پڑا۔ میرے سامنے دیدی کی پُرکشش تصویر آگئی۔ گویا جنت سے کوئی اپسرا کسی رشی منی کی تپسیا بھنگ کرنے نہیں بلکہ پیار و محبت اور خلوص کا پیغام دینے آئی ہو۔

دیدی کو میں بچپن سے جانتا ہوں، عمر میں وہ مجھ سے تقریباً چار سال بڑی تھی۔ ہم لوگ اکٹھے کھیلا کرتے تھے ـــــ گڑیا گڈوں کے کھیل، ناٹک وغیرہ ـــــ لیکن جب دیدی کے والد کا انتقال ہوا تو وہ ہم سے دور دور رہنے لگی۔ گویا کسی نے اس سے اس کے سارے ہی کھلونے چھین کر زبردستی بچپن کی پٹڑی سے اتار کر زندگی کی ریل پر چڑھا دیا ہو۔ اس نے اسکول جانا بند کر دیا اور وہ چوری چھپے لوگوں کے برتن صاف کرنے لگی۔ جبکہ دیدی کی ماں تقریباً تین سال بیماری کا بہانہ کر کے اپنے مرحوم شوہر کا سوگ مناتی رہی۔

ایک دن مجھے دیدی کی ماں نے بتایا کہ دیدی لوگوں کے کپڑے دھوتی ہے۔ کپڑے سیتی ہے اور محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو نرسری اسکول لیجاتی ہے ـــــ انہی دنوں میں نے دیدی کے چہرے میں ایک خاص تبدیلی پائی تھی، ایک منٹ کے لئے بھی چپ نہ رہنے والی نٹ کھٹ لڑکی جو خود بھی شرارتیں کرتی رہتی تھی اور ہمیں بھی شرارتیں کرنا سکھاتی تھی، ایک خاموش مجسمہ کی طرح ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی تھی گویا اس نے کوئی چیز کھوئی تھی، وہ کچھ کہے بغیر کوئی نہ کوئی کام کرتی رہتی تھی۔ کبھی کسی پڑوسی

کا سوئٹر بنتی تھی تو کبھی گھر کا چوکہ سنبھالتی تھی۔ میں اکثر اسے لطیفے سُنا سُنا کر ہنسانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن دیدی کے چہرے پر دن بدن مایوسی کی تہیں چڑھتی رہتی تھیں۔

انجینئرنگ کی تربیت مکمل کر کے جب میں گھر لوٹا تو میری ماں نے بتایا کہ دیدی ایک پرائیویٹ ہسپتال میں نرس کا کام کرتی ہے۔۔۔؟ لیکن ایک دن جب میں نے ریڈیو پر دیدی کا ایک درد بھرا گیت سُنا تو مجھے معلوم ہوا کہ دیدی ریڈیو پروگراموں کے علاوہ ڈرامے اسٹیج کر کے اپنے گھریلو مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور رمیش جو شراب نوشی، کوٹھوں اور مجروں کی وجہ سے انجینئرنگ کی تربیت مکمل نہیں کر سکا ہے۔ راجیش یوں تو دیدی سے فقط ایک سال چھوٹا تھا لیکن فلمی ہیرو بننے کے چکر میں اکثر بمبئی پونا اور مدراس جایا کرتا تھا۔ نمی، بملا اور کشوری کالج میں پڑھ رہی تھیں۔۔۔ اور دیدی کی ماں بس بستر پر لیٹے لیٹے محلے کی عورتوں سے گپ شپ کیا کرتی تھی ایک دن جب میری ماں دیدی کے گھر گئی تو وہاں ایک نہیں بلکہ کئی قسم کی مٹھائیاں، کاجو اور پھل تقریباً ایک درجن عورتوں میں بانٹے جا رہے تھے۔ میری بھولی ماں یہ سمجھی تھی کہ شاید دیدی کا جنم دن ہے۔ لیکن بعد میں وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح ہفتہ میں تین چار بار منہ میٹھا کرنے کے لیے دیدی کے گھر جانے لگی میں نے کئی بار دیدی سے ملنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اُس روز میں نمی سے ملنے گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی چند سہیلیوں کو ساتھ لے کر پکنک پر جا چکی تھی۔ دیدی گھر میں ہی تھی۔ ایک چھوٹے سے نیم تاریک کمرے میں سفید ساڑھی پہنے ہوئے دیدی بڑی محویت سے تان پورے کے تار چھیڑ رہی تھی، وہ بے حد مایوس نظر آ رہی تھی، ایک تھکے ہوئے راہی کی طرح!

مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی، مسرت سے اس کا چہرہ کھِل اُٹھا اور معمولی کی طرح اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے اپنے پاس بٹھایا اور مجھے رمیش یا راجیس کے بارے میں کچھ بتانے کی بجائے گڑیاں گڈّوں کے کھیل سے لے کر اپنے پتا جی کی المناک موت تک کئی حادثوں کی یاد دلاتی رہی، گویا میں اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا اور وہ مجھے اپنے ماضی کی یاد تازہ کرا رہی تھی۔ کبھی کبھی ہم دونوں مسکرانے لگتے یا ہنسنے لگتے۔ قہقہے لگانے لگتے اور کبھی کبھی ہماری آنکھوں سے آنسوؤں کی قطار بھی بہہ نکلتی اچانک ایک آواز سنتے ہی دیدی ایک دم بکلی طرح خاموش ہو گئی، بالکل اُسی طرح جیسے ایک بیوہ ہنستے ہنستے اپنی مانگ کو دیکھ کر سکتے میں آ جاتی ہے۔

"دیدی، فریج، کب آئے گا۔؟"

"گھر کا فرنیچر یک دم تھرڈ کلاس ہے دیدی!"

"دیدی! میں، فیشن کو، سے ساڑھیاں لے آئی ہوں—— بل تم دے آنا"

"دیدی دودھ والا!"

"دیدی کپڑے!"

"دیدی فیس!"

"دیدی مہمان!"

"دیدی روپے!"

"دیدی چیک، بلینک چیک!"

اور یہاں تک کہ ماں بھی چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

"میں دم توڑ رہی ہوں ـــ میرا بھی کچھ خیال کرو۔"

"سوپ میں نمک تھا ہی نہیں!"

"بلڈ پریشر دیکھنے والے ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

"پھل باسی تھے۔"

"ممی کی سہیلیاں آرہی ہیں، کچھ منگوا لو"

"کشوری کو کمشنر صاحب کی بیٹی کو برتھ ڈے پر پریزنٹ دینا ہے۔"

"راجیش کا تار آیا ہے ـــ اسے ٹی۔ایم او سے روپے بھیج دیئے نا!؟"

"سردیاں آرہی ہیں۔ کپڑے بنالو، نہیں تو تمہارے پتاجی کی طرح مجھ پر بھی فالج کا حملہ ہو جائے گا۔"

دیدی کچھ کہے بغیر میری طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کینسر کے مریض اپنے ڈاکٹر دیکھتا ہے اس کی نظریں آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے دیواروں میں شگاف پڑ جانے سے عمارت گر کر چکنا چور ہو رہی ہو۔

ملازمت کے سلسلے میں کئی سال دیہات میں رہ کر جب اپنے شہر تبدیل ہو کر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ دیدی اپنا سارا خاندان ساتھ لے کر ایک عالیشان بنگلے میں رہتی ہے۔ رمیش نوکری کے چکر سے دور فقط سیر، سپاٹے، شراب نوشی اور عورت کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ دیدی نہ تو ہسپتال میں کام کرتی تھی اور نہ ہی وہ ریڈیو اسٹیشن جاتی تھی۔ پھر ان کا بنگلہ، ممی کا بدلا ہوا مزاج، گھر کے ہر فرد کا رنگ ڈھنگ، شان و شوکت اور امیری کے نقوش دیکھ کر میں بھی سوچنے لگا، کہ شاید راجیش کا فلمی چکر کامیاب ہوا ہوگا۔

رکھشا بندھن کے دن مجھے دیدی کی بہت یاد آئی۔ اور اتفاقاً وہ مجھے اسی روز ایک چوراہے پر مل گئی، میں اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے پل بھر کے لئے مجھے گھور کر دیکھا اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی، یہی اکثر ہوتا رہا۔ کبھی ٹیکسی، کبھی ٹانگہ یا پیدل وہ مجھ سے نظریں بچا کر اس طرح نکل کر جاتی جیسے فرسٹ پوزیشن کا دعوے کر کے فیل ہو جانے والا طالب علم اپنے گھر والوں سے کتراتا ہے۔

دیدی فقط سفید رنگ کی ساڑھیاں پہنا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ کہتی تھی رنگوں کا کوئی شمار نہیں ہوتا، رنگ بدلنے کے ساتھ ڈھنگ بدل جاتے ہیں اور خواہشوں کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ لیکن اب دیدی نت نئے ڈیزائن کے رنگ برنگی ساڑھیاں پہنے نظر آتی تھی۔ شاید تخت تخت بنتے ہی اپنی ساری خاصیت بدل دیتا ہے ——
ایک دکان کے کاؤنٹر پہ آمنا سامنا ہوتے ہی میں نے دیدی کی ہر چیز بدلی ہوئی دیکھی، لیکن چہرہ وہی پرکشش چہرہ تھا جسے ہم بچپن میں جنم اشٹمی کے دن رادھا کا۔ دسہرہ کے دن سیتا کا —— اور شیوراتری کے دن پاروتی کا روپ دیکر ناٹک کیا کرتے تھے۔

دیدی کا وہی چہرہ آج بھی میرے سامنے تھا! اور رمیش کے کہنے پر اسکوٹر روک کر گم صم سا بیٹھا رہ گیا تھا۔

رمیش، دلال کے ساتھ نہ جانے کیا کیا باتیں کر رہا تھا۔ اچانک وہ ہنسی قہقہے لگانے لگے ...... میں چونکا اور پھر غصے پر قابو پانے کے لئے یکے بعد دیگرے کئی کِک دیکر جب اسکوٹر اسٹارٹ کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے رمیش ریت کے ایک پربت پر چڑھنے کی کوشش کرتے کرتے ریت کے نیچے دبا جا رہا ہے۔ میں نے گیئر بدل کر آگے جانا چاہا تو رمیش ہانپتا کانپتا میرے آگے کھڑا ہو کر روتے ہوئے چلانے لگا۔

"انل مجھے مار ڈالو...... اس جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ میری آنکھیں نوچ ڈالو!" اور وہ دھڑام سے گر کر بیہوش ہو گیا۔

میں نے جب رمیش کو کندھے پر اٹھایا تو میری نگاہ دروازے کے سہارے کھڑی سبز رنگ کی باریک نائیٹی پہنے ہوئے ایک بے حد حسین عورت پر رک گئی ۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور وہ اپنا منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی ۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے کندھے پر رمیش نہیں بلکہ گرم لوہے کا ایک وزنی گولہ ہے ۔ میری آنکھوں میں جیسے گرم گرم سلاخیں ڈالی جارہی ہیں میری ٹانگیں جیسے دلدل میں پھنس گئی ہیں اور میں زور سے چیخ پڑا ۔

" دیدی تم ! "

"لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا؟"

"جی نہیں میں نے گاڑی منگوائی ہے۔ آرہی ہوگی۔"

"لاش کہاں ہے؟"

"وہ اُس طرف۔"

"آیئے لاش کا جائزہ لیں۔"

"لاش کا رنگ تو نیلا ہے۔ غالباً زہر کا استعمال ہوا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ لگتا ہے سائنائڈ کا استعمال ہوا ہے۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں۔ چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہے کہ موت اچانک ہوئی ہے...... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ

اس بدنصیب عورت کے ساتھ کوئی اور بھی سویا تھا؟"

"قاتل کے سوا اور کون ہو سکتا ہے"

"کچھ بھی کہہ نہیں سکتے - کیا اس مکان میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟"

"کوئی نہیں"

"گھر میں کوئی نوکر وغیرہ"

"وہ بھی نہیں"

"ہوں...... اگر واقعی سائینائڈ کا استعمال ہوا ہے تو یہ خود کشی بھی ہو سکتی ہے اور قتل بھی.... آپ کی ابتدائی تحقیق کیا کہتی ہے؟"

"قانونی طور پر تمام ضروری معلومات آپ اس فائل میں دیکھ سکتے ہیں اس کے علاوہ"

"کیوں کیا کچھ کانفیڈنشیل بھی ہے"

"میرا کچھ ذاتی تجزیہ، اب تک نہ جانے کتنے ہی قتل کے کیسوں سے واسطہ پڑا ہے- لیکن ہر قتل کے پیچھے ایک راز تھا- دولت شہرت، عورت- نفرت یا انتقام- لیکن- اس قتل کے پیچھے کوئی راز نہیں- بس ایک تلخ کہانی ہے- وہ کہانی جو ہمارے قانون کے ڈھانچے میں ایک معمولی واقعہ ہے- یعنی جذباتی بحران- جو ایک انسان کو پاگل بنا دیتا ہے اور پاگل پن ہی قتل کا باعث بن جاتا ہے- اگر آپ غور کریں تو یہ کہانی لاکھوں، کروڑوں اشخاص کی کہانی ہے"

"انسپکٹر- پلیز بی بریف- میں جلدی میں ہوں- مجھے

کیس کی تفصیل چاہیئے ابتدائی کارروائی کے بارے میں آپ کی مکمل رپورٹ۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کر دفتر پہنچتے ہی اخبار نویس مجھ پر سوالات کی بوچھار کریں گے۔"

"میں نے اپنی کارروائی مکمل کی ہے۔"

"ایف۔آئی۔آر۔ کس نے دیا۔"

"قاتل یعنی مقتول کے شوہر نے۔"

"قاتل حراست میں ہے تا۔"

"ہاں — لیکن ہسپتال میں۔"

"مینٹل ہسپتال میں۔"

"جی نہیں۔"

"پھر۔"

"میڈیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کمرہ نمبر دس میں۔"

"کچھ بیان دیا۔"

"جو کچھ بیان کرنا چاہتا تھا وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ بیان قلم بند ہوا یا نہیں۔"

"جی نہیں ڈاکٹر رمن کے کہنے کے مطابق قاتل ٹیلیفون پر ایف آئی۔آر دیتے ہی بے ہوش ہوا اور وہ ابھی تک کوما، کی حالت میں ہے۔"

"ہوں ۔"

" یہ خط اور میاں بیوی کا وہ فوٹو جو قتل سے کچھ ہی دن پہلے کھنچوائی گئی ہے ۔"

" جی ہاں خط لگ بھگ چھ مہینے پہلے لکھا جا چکا ہے ۔ تاریخ ۱۰۔ جون ۱۹۷۱ء خط قاتل کے پاس ہی رہا ہے ۔ لگتا ہے خط کو بار بار پڑھا گیا ہے خط کو دیکھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خط کو پھاڑنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یعنی خط ایک ذہنی کشمکش کا مرکز رہا ہے ؟"

" مطلب ۔۔۔ ؟"

" مطلب یہ کہ قتل چھ مہینے پہلے بھی ہو سکتا تھا ۔"

" رائیٹ ۔ شاید آپ کا اندازہ درست ہو ..... لیکن کیا میاں بیوی میں کچھ نظریاتی اختلاف تھا ۔ یعنی دونوں کے درمیان کچھ تناؤ ۔ میرا مطلب ہے ۔"

نہیں نہیں ۔ شک و شبہ کی کوئی دلیل نہیں ۔ یہاں محلے والوں کے بیان کے مطابق دونوں ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے تھے ۔"

" پیار میں ظاہرداری یا بناوٹ بھی تو ہو سکتی ہے آخر قتل جیسا کہ خط سے بھی ظاہر ہے چھ مہینے پہلے ہو سکتا تھا کسی وجہ سے ہی تو ہوا ہو گا ۔"

" یہ خط پڑھ لیجیے ! "

"ہندی میں لکھا ہے ۔ آپ پڑھ کر سنائیں ۔"

"سنئے ۔ تاریخ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ۔"

میری پیاری بیوی رادھا آج اچانک مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ پر سینکڑوں بجلیاں گر گئیں ۔ پھر زور کا طوفان آیا اور میں ایک تنکے کی طرح تم سے بچھڑ کر بہت دور چلا گیا ۔ کچھ تاریک و ویران کھنڈروں میں جہاں میری چیخ و پکار بھی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے ۔ میں نے جب تمہیں دور سے دیکھا تو تم سفید کپڑوں میں ملبوس تھیں ۔ تمہاری مانگ کا سیندور اجڑ گیا تھا ۔ اور تم بے بس و لاچار تھیں ۔ تمہاری آنکھیں تر تھیں لیکن تمہیں دیکھنے والی آنکھیں ان خریداروں کی تھیں ۔ جو مجبوری کا سودا کرتے ہیں ۔ تمہارے آگے پیچھے ۔ سماجی اور اقتصادی بھیڑیئے تھے ۔ میں چیخ اٹھا ۔ تمہارے پاس آنا چاہا لیکن تقدیر کے آگے میری تدبیر ناکام ہوئی ...... ہاں ..... آج ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میری بیماری لا علاج ہے ۔ کچھ ہی دیر بعد تم سچ مچ بیدھوا ہو جاؤ گی اور میں بچھڑ کر دور بہت دور چلا جاؤں گا .... مجھے تم سے پیار ہے زندگی سے پیار ہے لیکن مجھے کوئی نہیں بچا سکتا ۔ تم بھی نہیں .... تم خدا سے تو نہیں ۔ لیکن چاند پہ فتح پانے والے ان لوگوں سے ضرور فریاد کر سکتی ہو کہ وہ اس بیماری پر قابو پا لیں اور مجھ جیسے کروڑوں لوگوں کی جانیں بچائیں تم جیسی کروڑوں ودھواؤں پہ ترس کھائیں ۔ ان گنت یتیموں پر رحم کریں .... لیکن تمہاری

آواز دب جائے گی ـــــ تم روتی کیوں ہو میرے ساتھ چلو۔ میری ہمسفر بن کر۔ اب ہماری منزل موت ہی ہے۔

تمہارا اپنا کرشن "

"اُف ......"

"آپ کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں"

" ہاں۔ اِن آنکھوں کے سامنے ہیروشما۔ ناگاساکی اور ویٹ نام کی تصویر ہے۔ دھرتی کی کوکھ کو بانجھ بنا کر زہر پھیلانے والے بم ہیں۔ اس سے پیدا شدہ خطرناک بیماریوں کی زد میں آئے ہوئے کروڑوں تڑپتے ترستے رہتے ہیں اور جہاں میرے کانوں میں آنجہانی رسل کی فریاد گونج رہی ہے۔ وہاں طرح طرح کے جہازوں کی گڑگڑاہٹ بھی گونج رہی ہے۔ انسپکٹر شرما کہیں قاتل کو کینسر تو نہیں ہے؟"

جی ہاں۔ ڈاکٹر رمن نے یہی کہا ہے "

••

"رحمٰن تم ٹاور پر چڑھ کر فلڈ لائٹ (FLOOD LIGHT) سنبھالو"
"گوپال لائٹ آن کرو"
"وہ بتی آف کرو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے"
"رامو، بیک لائٹ کچھ زیادہ برائٹ ہے اسے تھوڑا ڈِم کرو"
"سبھاش ٹرالی کی مومنٹ (MOVEMENT) چیک کرو۔ جلدی کرو"
"چیک کرو۔ جلدی"
"ساؤنڈ تو ٹھیک ہے نا؟"
"گوپی اپنے ساتھیوں کا کاسٹیوم چیک کر کے انہیں سیٹ پر لاؤ"

"ارے ارے وہ دیکھو اس گدھے کی مونچھیں سفید ہیں اور
ڈاڑھی کالی!"

"ستار تمہارا کاسٹیوم بالکل ڈھیلا ہے - درباری تو کیا تم درزی
بھی نہیں لگ رہے ہو۔"

"قادر خان! سکرپٹ لاؤ۔"

"بھئی، پورس ابھی تک تیار نہیں ہوا۔"

"سکندر ۔۔۔ راجہ امبھی .... سلوکس ..... بھئی وہ
لوگ سیٹ پر تو نہیں ہیں۔"

"پورس تم! واہ واہ .... آج تمہاری شخصیت کو داد دینے
کو جی چاہتا ہے ...... کیا بات ہے - میک اپ میں نے تو بس کمال کر دیا
ہے - باقی سب ٹھیک ہے - لیکن یہ کیا نقلی بیڑیاں؟ ....
نہیں نہیں بھئی! اصلی پہن کے آؤ - سین ریلسٹک (REALISTIC)
ہوگا ...... اور ہاں یہ تمہارے ماتھے کے زخم کچھ زیادہ گہرا نہیں ہے
میک اپ مین کو بلاؤ!"

"صاحب زخم اصلی ہے - پورس کل گھوڑے سے گر گیا تھا - میں
نے اصلی زخم کو ہی تھوڑا ریلسٹک (REALISTIC) بنا دیا ہے
صاحب - خون بھی اصلی ہے۔"

"واہ ...... پورس تم واقعی کلاکار ہو .... آفریں! .... اچھا
بھئی سنو لیکن غور سے ...... بس ایک بار سمجھا دوں گا .... سین سکندر

کے دربار کا ہے۔ تم پورس ہو۔ راجہ پورس جو دربار میں ایک قیدی بن کر کھڑا ہے۔ اُسے لڑائی میں شکست ہوئی ہے اس لئے تمہارے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے ہی ہونے چاہئیں تم اس دائرے میں کھڑے رہو گے...... ایسے...... اور میرے پہلے اشارے کے ساتھ تمہاری ایکشن (ACTION) یہ ہوگی — سمجھے !؟ دوسرے اشارے کے ساتھ تم راجہ امبھی کو اور پھر سلوکس کو یوں دیکھو گے...... وہ لوگ وہاں ہوں گے۔ میرے تیسرے اشارے کے ساتھ تم صاحب کے سامنے ایسے کھڑے رہو گے..... وہ تم سے مخاطب ہو کر کہیں گے — بول پورس! — تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

"تمہارا جواب ہو گا — جو ایک راجہ دوسرے راجہ کے ساتھ کرتا ہے" بس اپنا مکالمہ اور ایکشن اچھی طرح سے یاد کر لو۔ اور — کے — اور باقی لوگ یعنی درباری خاموشی سے فقط پورس کو دیکھتے رہنا"

اسسٹنٹ ڈائریکٹر وامن پوری نے اپنے سر پر گنتی کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اطمینان کا سانس لیا اور اسکرپٹ قادر خان کے ہاتھ میں تھما کر کیمرے سے سیٹ کو مختلف زاویوں سے دیکھنے لگا۔

"قادر خان — صاحب سیٹ پر نہیں آئے"

"نہیں — وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

"وہاں اور کوئی بھی ہے؟"

"ہاں ——— ہیروئن، اس کا چمچہ یا شوہر یا ——— سکریٹری۔
"یار شوٹنگ دس بجے شروع ہونی تھی ——— گیارہ تو بج گئے
ہیں ——— وہ لوگ کیا کر رہے ہیں وہاں؟"
"صاحب کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے ———"
"صاحب کا میک اپ ہوا ہے؟"
"ہاں۔"
"لیکن جھگڑا کس بات کا؟"
"بلیک اینڈ وہائٹ کا ——— صاحب بلیک میں دو لاکھ لے
چکا ہے ——— وہ لوگ ایک اور مانگ رہے ہیں۔"
"کیا ——— ! ——— اچھا ——— اچھا ——— ایک سگریٹ ہے؟"
"ہاں ——— لیکن چلو وہاں ایک دو کش لگائیں ———"
"یہاں کیوں نہیں ———؟"
"سیٹ پر سگریٹ پینا سیٹ کی توہین ہے؟"
"اور اگر صاحب آئے تو؟"
"چھوڑو یار سگریٹ نہیں پئیں گے ———"
"قادر خان۔ تمہیں کوئی انسٹالمینٹ .... (INSTALMENT)
ملا ہے؟"
"ہاں ——— لیکن ایک فلمی سچویشن کی بدولت یعنی قربانی
بیماری قرضہ وغیرہ ——— ہاہاہا ——— ہاہا ——— ہاہا۔ لیکن پانچسو روپے فقط!"

"اس فلمی چکّر میں تم تخت سے تختے پر آ گئے ہو!"
ارے تم بھی بیس سال سے فلمیں بناتے آئے ہو اور اپنے دام
۰۰ ۷ روپے ماہوار سے کبھی نہیں بڑھا سکے ہو۔۔۔ ہوں۔ قلم منشی
ہے تو فاقہ کشی کرتے ہو اور اگر فلم سلور جوبلی ہو تو چھ مہینے کی تنخواہ
ایک ساتھ لیتے ہو۔ کیا زندگی ہے۔"
"تو کیا کریں!"
"جہاد!"
"خاموش، شاید صاحب آ رہے ہیں۔"
"ارے یہ تو ہیروئن کا چمچہ ہے۔ صاحب کو بلا دوں۔"
"ہاں ہاں...... دیر ہو رہی ہے، لیکن سنو وہ خود ہی
آ جائیں گے۔"
"وہ ناراض ہو جائیں گے یار ——— نوکری کا معاملہ ہے۔"
"یار تم بھی ڈرتے ہو، میں بھی ڈرتا ہوں ——— آخر پہل
کون کرے گا؟"
"پہل کس لئے ———؟"
"صاحب کو بلانے کے لئے؟"
"وہ آ گئے ——— آداب ——— آداب عرض جناب ——— شوٹنگ
شروع کروں!"
"دس منٹ کے بعد!"

" یار صاحب کے ہاتھ سے سگریٹ اور لوٹا لیتا...."

" ان کی کلا شراب کی محتاج ہے۔ پرمٹ ہوٹل ہیں!"

" واہ کلا اور شراب! یار پھر ہر شرابی کلاکار کیوں نہیں ہوتا؟"

" قادر خان تم ادیب نہیں ——— صرف قلمی ادیب ہو ——— یہاں ساحر صاحب بھی، تیل مالش جیسے گیت لکھتے ہیں ——— جاؤ۔ صاحب کو ڈائیلاگ یاد کراؤ۔ بس تب تک راجہ ایبھی کے چند کلوز اپ اور درباریوں کے کچھ شاٹ لوں گا۔ جلدی آنا ——— نہیں نہیں کوئی جلدی نہیں۔ جب صاحب کہیں تب آنا۔ ہوں"

" پانی ——— پانی ——— پانی!!!"

" کیا ہوا ——— بھئی کیا ہوا؟"

" شاید سیٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ رائٹر۔ پروڈیوسر ڈائرکٹر ایکٹر امرت جوہر کے ہاتھ سے وہسکی کا گلاس گر گیا۔"

" نہیں نہیں پورس بے ہوش ہو گیا۔" ایکسٹرا سپلائر راٹھور نے راجہ ایبھی کا میک اپ اتارتے ہوئے کہا۔

" دھت تیرے کی" امرت جوہر نے اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے اپنی گھبراہٹ کو سپر ایکٹنگ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

" صاحب پورس بے ہوش ہو گیا!" قادر خان چلانے لگا۔

" قادر خان میرے ڈائیلاگ کیا ہیں؟" جوہر غصے سے چلانے لگا اور سلوکس جو اپنے میک اپ میں فقط عینکوں کا

اضافہ کر کے پروڈکشن کے جعلی اکاؤنٹ بتا رہا تھا یا رہا رقادر خان کو خاموش رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

"پورس بے ہوش ہو گیا !"

"اچھا ہوا ——— سالے بڑے اسٹار ——— ! الو کمبخت ڈیٹ ہی نہیں دیتے جب دیتے ہیں تو وقت پر نہیں آتے ——— اور جب آتے ہیں تو اتنی پی کر کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں ." پروڈیوسر بھائیہ زور سے چلاتا ہوا سیٹ پر آ گیا ۔ اس کمبخت نے تو میرا لاکھوں روپیہ مٹی میں ملا دیا ہے ۔ کانٹریکٹ کے پچاس دن تو ایسے ہی برباد کئے اور اب فلم مکمل کرنے کے روز کا ہزار وائیٹ اور ۵ ہزار بلیک مانگتا ہے ۔ کروں تو کیا کروں ۔ اب تو اسٹی بیوٹ کی سستی ہیروئین کلپی سیکسی ہیروئن بن گئی ہے، وہ بھی کام کرنے کے لئے کچھ ایسی ہی شرطیں رکھ رہی ہے ۔ چار بار تو دو دو لاکھ کے سیٹ بغیر کام کئے توڑنے پڑے ۔ خیر میرا جو ہوا سو ہوا اب تو تم بھی گئے کام سے ——— !"

"ہوں ——— بھائیہ ——— میری فلم فقط دو پہیوں پر چلتی ضرور ہے لیکن میرے پاس ہر وقت سٹپنی موجود رہتی ہے یعنی جو دھیل (WHEEL) پنکچر ہو جائے فوراً بدل لیتا ہوں ۔ سالہ ایک پورس بے ہوش ہوا تو دوسرا پورس آئے گا ۔ سمجھے" جو ہر نے وہسکی کا ایک گھونٹ حلق سے اتار کر کہا ۔

"تو کیا پورس ———؟"

"جی ہاں ڈپلیکیٹ (DUPLICATE) ڈمی ادکار......
روز کے تیس روپے دیتا ہوں کلوز اپ میں پہلے ہی لے چکا ہوں... ہاہا۔
"یو آر جینیس (Y ARE GENIOUS) گریٹ ہو پاپے لیکن ۔"

"لیکن کیا۔ ؟"

"ان جونیر آرٹسٹوں کی جیب سے یونین بن گئی ہے بس ان کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"جونیر آرٹسٹ تو کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں۔ یہ رنگ و روپ انہیں ہم دیتے ہیں۔ بھلا کٹھ پتلیوں کا بھی دماغ ہوتا ہے! یاران لوگوں کی ڈور ہمارے ہاتھ میں جب بھی تھی اور آج بھی ہے۔"

"ہوں۔ جوہر تم نے شاید وہ ٹیلی ویژن پر۔"

"ہاں ہاں۔ اس کے بارے میں سنا تو ہے لیکن دیکھا نہیں۔ بھئی میرے پاس وقت ہی کہاں کہ ان فضول چیزوں کی طرف توجہ دوں۔ فلم انڈسٹری کے مسائل، کلانگر، انکم ٹیکس، سیاسی پارٹیوں کے لئے پروپیگنڈہ، چندے، مذاکرات، یار ہماری انڈسٹری میں تمہیں کیا معلوم کیا ہورہا ہے!"

"صاحب پورس کو موت کی الٹی آگئی ہے!!"

"کاسٹیوم اتار کر اسے سیٹ سے ہٹادو۔ سلوکس سے کہو کہ راٹھور سے نیا پورس لے آئے۔ وہ پاس والے اسٹوڈیو میں پرتھوی راج کے سیٹ پر جے چند کا رول ادا کر رہا ہوگا۔"

" صاحب شوٹنگ کینسل کردوں " دامن پوری چلّانے لگا۔

" مگر کیوں ——— میں تو تیار ہوں "

" صاحب پورس مر گیا !"

" نہیں مارا گیا ———" گوپی نے بیڑی سلگا کر کہا۔

" سکندر کی تلوار سے !" سبھاش نے آہستہ سے کہا۔

" نہیں ——— پورس کی فوج میں ہاتھی جو تھے ———" رحمٰن نے فلڈ لائٹ کو دائیں بائیں گھما کر کہا گویا وہ ہاتھیوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔

" ہاں پھر جہلم میں طغیانی آ گئی تھی ———" ایک جونیئر آرٹسٹ نے اخبار کی سونڈ بنا کر کہا اور ایک ہاتھی کی طرح چلنے لگا۔

" پورس کو راجہ امبھی نے کمزور کیا " قادر خان چلانے لگا۔

" راجہ امبھی غدار ہے !"

" ہاں۔ ہاں۔ ہمیں بھی دس دن سے پیسے نہیں ملے ہیں !!"

" بیچارا پورس کمزور تھا۔"

" نہیں ——— سکندر طاقتور تھا۔"

" پورس بھوکا تھا ——— اور ہم نے بھی چار دن سے کھانا نہیں کھایا ہے !"

" واہ ۔ یہ مہارانی کیا اپنے بچّوں کو لے کر میدان جنگ میں کود پڑی ہے "

" جھانسی کی رانی !" رحمٰن نے آہستہ سے کہا۔

"یہ پورس کی بیوی ہے - ہیروئن بننے آئی تھی - اب بچے ہو گئے تو جونیئر آرٹسٹ بھی نہیں رہی" لائٹ مین نے تلخی سے کہا۔

اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دامن پوری کیمرے کی آنکھ سے ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ رنگ برنگا سیٹ، چمکتی ہوئی روشنیاں، مایوس درباری۔ قہقہے لگاتا ہوا سکندر۔ اور ایک کونے میں لاش۔ ڈمی، جس کا نام نہیں ہوتا دام نہیں ہوتا۔ بس مختصر سا کام ہوتا ہے۔"

"شوٹنگ کینسل کر دوں صاحب!"

"نہیں - پورس آ گیا ہے"

دامن پوری نے ایک بار پھر سیٹ کا جائزہ لیا۔

"لائٹ!"

"ساؤنڈ!!"

"ایکشن!!!"

"بول پورس! تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" جوہر نے گرج کر کہا۔

"جو ایک آرٹسٹ دوسرے آرٹسٹ کے ساتھ کرتا ہے!" قادر خان کا جواب تھا۔

"ارے ارے یہ تیر کی طرح کہاں آگے نکلے جا رہے ہو میاں۔"

"جی ڈائریکٹر صاحب سے ملنے۔"

"آہا۔ ہاں۔ ارے حضور میں کب کہہ رہا ہوں کہ کسی کنڈیکٹر سے ملنے جا رہے ہو۔"

"جی ذرا تمیز سے بات کیجیے۔"

"لگتا ہے بمبئی میں نئے نئے آئے ہو....." دربان نے اس کے پھٹے جوتے سے لے کر اس کے لانبے لانبے بالوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے۔ میں کوئی لنگور ہوں یا کسی نمائش کی شئے

ہوں جو اس طرح اِن گستاخ نظروں سے دیکھ رہے ہو مجھے "
واہ میاں ۔ آنکھیں دکھانے لگے ۔ دراصل میں یہ دیکھ رہا
ہوں کے جناب کی شکل دلیپ کمار سے ملتی ہے یا راجکپور سے
یعنی میرا مطلب ہے ۔ یہ ہیرو بننے کا شوق کیونکر پیدا ہو گیا ۔۔۔۔"
" دربان نے طنزاً ہنس کر کہا اور داتوں تلے دبے بیڑی کو سلگاتے
ہی ایک فاتح کی طرح لمبے لمبے کش لینے لگا ۔
"جی راستے سے ہٹ جایئے ۔ کہہ چکا ہوں کہ ڈائریکٹر
سے ملنا ہے "
" کونسے نمبر والے ؟"
" اوہو ــــ بھئی مجھے گنتی نہیں آتی ہے ۔ ڈائریکٹر سے
ملنا ہے ڈائریکٹر سے جی "
" کون ــــ سے ــــ نم ــــ بر ــــ والے ــــ فسٹ
سیکنڈ ــــ تھرڈ ــــ یا فورتھ ــــ "
" جی مسٹر سنہا ــــ ولو سنہا ــــ سمجھے ــــ "
" اچھا جی ــــ پاس ہے ــــ ؟"
" یہ چٹ دیکھیے ــــ میری تو آج (Appointment) ہے "
" اجی حضور اِدھر چٹ پٹ نہیں چلتی پرمٹ چلتی
اندر شوٹنگ ہوتی یعنی (set) پر ننگا ناچ ہوتی ــــ ہاں ــــ "
دربان نے ایک خاص طرز کلام کے ساتھ ساتھ محمود نقل کرنے

ہلوئے کہا۔
"بھئی حد ہوگئی —— ذرا ہوش و حواس ہے تو کام لو ——
میں ایک رائیٹر ہوں —— ادیب —— کچھ آیا خیال شریف میں"
"ہاں غالباً آرام لیلا لکھتے ہوں گے ——"
"اف بھئی —— مجھے براہ کرم اندر جانے دو —— یہ چیٹ
اپنے پاس رکھو اور مجھے ——"
"ارے باپ رے —— یہ تو واقعی پاس ہے ——
معاف کرنا ادیب جی —— آپ اندر جا سکتے ہیں"
سٹوپڈ (stupid) یہ کہتے ہوئے وہ اندر جانے لگا"
"واہ رے ادیب سے کہانیاں ہندی میں اور گالیاں
انگریزی میں .... خیر گھبراؤ نہیں بیٹا۔ یہ فلمی دنیا ہے اندر جانے
والا گالیاں دیتا ہے اور باہر آنے والا گالیاں سنتا ہے ....
ہم نے بھی کبھی سنائی تھی اور اب سن رہے ہیں"
یہ کہتے ہی دربان نے تلخ گھونٹ پی کر ایک اداکار کی کار
گزرنے کے ساتھ سلوٹ کیا اور پھر مڑ کر اسٹوڈیو کے باہر کھڑے
رنگ برنگے کپڑے پہنے۔ نوجوان لڑکے و لڑکیوں کو دیکھنے
لگا جو اسٹوڈیو کی جگمگاتی روشنی کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔

(۲)

ارے ہاں بھئی ــــــ ہاں ــــــ فلم کا بجٹ تیار ہو گیا ہے سٹوں کا کام بھی شروع ہے۔ میوزک بھی تیار ہو رہا ہے۔ چھ گانے ریکارڈ ہو چکے ہیں بس لتا جی بیمار تھی نہیں تو باقی گانے بھی تیار ہوتے۔ کاسٹ تو میاں تے منتخب کر لی ہے۔ بس اگر پریشانی ہے تو ایک کہانی کی ــــــ وہ نہیں مل رہی ہے۔ پنڈت سکھ رام شرما سے لے کر برج کنیال تک سب سے بات کر چکا ہوں۔ لیکن بات کچھ بنتی نہیں ــــــ بے کس! وہ تو یار تڑپاتا ہے۔ بات ہی نہیں کرتا اور اگر کچھ بن بھی جائے تو یار معاوضہ تو لاکھ سے کم نہیں مانگتا "یاروں کی تارو" نے جو سلور جوبلی منائی ہے۔ خیر کچھ بھی ہو مہورت تو دس تاریخ کو ہی ہوگا ــــــ ضرور آنا یار ــــــ" سنہا نے ٹیلی فون کا رسیور چھوڑ کر سگار سلگایا اور قہر آلود نظروں سے جیٹ دیکھنے لگا۔

"اندر بلاؤ" وہ گرجنے لگا۔

"آداب عرض"

"آپ میرے اسسٹنٹ رام کمار سے مل چکے ہوں گے"

"جی نہیں۔ آپ کے دربان سے مل چکا ہوں۔ بڑا گستاخ ہے۔ ارے ہاں بے کس صاحب نے تو آپ کے ہی بارے میں فرمایا تھا۔ اس

لئے میں (DIRECT) آگیا ہوں "۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر اچانک احساس کم تری کا شکار ہو کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے وہ کرسی پر کبھی بیٹھا ہی نہیں تھا۔

" یہ کس صاحب آپ کے رشتہ دار ہیں۔ کوئی (COUSIN) وغیرہ ___ ؟"

" جی۔ میرا بچپن کا ساتھی ہے۔ اور کالج کا دوست۔ ہم ساتھ ساتھ ڈرامے کھیلا کرتے تھے اور جب میں کالج کے میگزین کا ایڈیٹر تھا تو بے کس میرا اسسٹنٹ تھا " اس نے فخر سے کہا اور سنہا کے اشارے کے ساتھ ہی وہ کرسی پر بیٹھنے لگا۔

بے کس کا نام سن کر سنہا نے تعریفوں کے پل باندھے جس سے اس کا احساس کم تری دور ہو گیا کیونکہ بے کس اس کا لنگوٹیا یار تھا اور وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا اور فلموں کی نقل کر کے ہندی میں کہانیاں لکھنا اس کا پیشہ تھا۔

" تو جناب میں آپ کو کہانی سناؤں۔ میں نے خلاصہ تو انگریزی و ہندی میں لکھا تو ہے تاہم اگر آپ اجازت دیں بہ زبانِ خود پیشِ خدمت رکھوں "

" نام کیا ہے ؟ "

" کالی سحر ___ "

" پلاٹ کا نہیں ___ آپ کا ___ " سنہا نے مسکراتے

ہوئے کہا۔
"وجے کمار شرما۔"
"آپ کا تخلص وغیرہ کچھ نہیں ؟"
"جی نہیں۔"
"کبھی ہیرو بننے آئے ہو یا ادیب ؟"
"ویسے تو ہیرو کا کام بھی کر سکتا ہوں۔ بے کس سے ہی پوچھئے
تاکر جودھپور کے انجینئرنگ کالج میں تو میری ایکٹنگ کا دب دبا ہوا کرتا
تھا۔ ہر سال کوئی نہ کوئی اعزاز لے ہی لیتا تھا۔"
"تو انجینیر بنتے بنتے رہ گئے ہوں گے۔"
"نہیں سر ــــ کچھ مہینے پہلے کشمیر میں انجینیر ہی تو تھا اچھا تو
آپ کو سکرپٹ سناؤں ؟"
"آپ نے اپنے پلاٹ کے لئے تب کشمیر ہی کا بیک گراؤنڈ لیا
ہوگا۔" سہنا نے کچھ سوچ کر کہا۔
"کشمیر ہی نہیں جناب۔ بھارت کا کوئی گاؤں میری کہانی کا
بیک گراؤنڈ ہو سکتا ہے۔ میری کہانی تو بالکل انوکھی ہے سہنا صاحب۔"
"جی ــــ انوکھی کونسی بات ہے ؟" سہنا چونک پڑا۔
"ہاں ــــ آج کل کی فلموں سے الگ تھلگ۔ ایک انقلابی
تصویر جس میں حقیقت کے رنگ ہیں۔ کہانی ہے ایک گاؤں کی
جہاں بارش اور سیلاب کھیتوں کو ہر سال کھا جاتے ہیں۔ لوگ

بھوکے مرتے ہیں ننگے پھرتے ہیں اور غریبی، افلاس و لاچاری بچوں کو قتل کر دیتی جوانی کو روند ڈالتی ہے اور بڑھاپے کو گھسیٹتی ہے۔۔"
وجے نے اچھی طرح سے پلاٹ بیان کیا اور بے صبری سے سنہا کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

"ہوں ــــــ" سنہا نے سگار کا دھواں پھینکتے ہوئے کہا۔
"جی آج تک تو ایسی فلم کوئی نہیں بن سکی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ میری پسند کا کاسٹ بھی لیں۔ تو یہ فلم ہٹ ہو جائے گی۔ لوگ بیدار ہو جائیں گے سنہا صاحب ــــــ انقلاب آئے گا اور کامیابی کا سہرا تو ہمارے ہی سر ہوگا ــــــ دیکھئے تو میں نے صرف کہانی کا (screen plays) مکالمے ہی نہیں تیار کئے ہیں بلکہ سین ( ) بھی کئے ہیں اور ریہال تک کر ( )
بھی ــــــ دیکھئے ــــــ دیکھئے ــــــ سنہا صاحب مرحوم محبوب کی فلم 'روٹی' تو یاد کیجئے اور دیکھئے وہ فلم اپنے مقصد میں کتنی کامیاب رہی ـ"

"روٹی ــــــ نہ رہا محبوب نہ وہ فلم انڈسٹری ــــــ ویسی کہانیاں برٹش راج میں چلتی تھی۔ اب ایسے تھیم مر چکے ہیں اور وہ ڈائریکٹر بھی۔ سمجھے! اب چونکہ دے بے کس، نے کہانی لینے کی سفارش کی ہے اس لئے میں (RISK) لیتا ہوں۔ لیکن ضرورت کے مطابق تبدیلیاں یا تو دے بے کس، صاحب کو کرنی پڑیں گی یا نیات خود سمجھے۔

"جی تبدیلیوں کی کیا ضرورت ہے؟"

"تب تو آپ کی کہانی کی بھی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں ــــ نہیں ــــ اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو ضرور کیجیے ــــ" اُس نے دل پر ایک پتھر رکھ کر کہہ دیا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کے سر پہ پائل (ہمالہ) دبانے والا ورقی گولا پڑ رہا ہو۔

"ٹھیک ہے۔ تو آپ کل دفتر میں آکر کنٹریکٹ کر لیں ــــ" سنہا نے سکریپٹ بغل میں دبا کر کھڑے ہو کر کہا اور کار میں سوار ہو کر اسٹوڈیو سے چلا گیا۔

(۳)

ایک ہزار ہوں۔ دو۔ تین۔ چھوڑو جی یہ بھی کوئی رقم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں دس ہزار سے کم تو دیں گے نہیں۔ اور پھر میں اس سے کم لوں بھی کیوں۔ آخر کہانی ہے۔ منظر نامہ ہے۔ مکالمے ہیں۔ خیر جو کچھ بھی ملے اس کا آدھا حصہ تو گھر بھیج دوں گا تاکہ قرضہ صاف ہو جائے اور والدین اطمینان کا سانس لے سکیں۔ پھر بچے۔ ارے ان کو تو یہاں بلا لوں گا۔ لیکن ابھی کہاں پہلے میرا بنگلہ تو بن جائے۔ کار تو آئے۔ پھر ایک دن سب کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر سارے سٹوڈیوں کی سیر کراؤں گا۔ تاکہ میرا رعب دیکھ کر

میری بیوی کبھی سمجھ سکے کہ میں رات کے تین تین بجے کیا لکھا کرتا تھا۔
اخباروں میں میری فوٹو آئے گی اور جب مجھے "کالی سحر" لکھنے پر
صدرِ جمہوریت کی طرف سے ایوارڈ ملے گا تو اُس دن میں اُن سب
ادیبوں کو جلانے کے لئے مدعو کروں گا جنہوں نے آج دن تک میرے
فن کو لفٹ نہ دی۔ میرے قلم کی رکھوالی نہ کی مجھے گھر سے بے گھر کر کے
دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کیا۔ میں ان سب سے بدلہ
لوں گا۔"

"ارے ارے کیا بات ہے کشمیری بابو۔ کس سے بدلہ لینا ہے؟"
ہوٹل کے مالک کم منیجر کم باورچی نے فلم اچانک بند کر کے لفظ "ہے"
پر زور دے کر کہا۔

"اوہو ۔۔۔۔۔ ایسے ہی چلا اٹھا۔ رام ناتھ جی! وہ میرا مطلب
ہے۔ میرا مطلب ہے پنڈت رام ناتھ رستوگی جی ۔۔۔ وہ ذرا فلم
آن تو کر دو۔"

"واہ بھیا! ۔۔۔۔ ایک روپے کے کھانے کے ساتھ تو
روز آٹھ آنے کا سر درد ہوا مفت لیتے ہو ۔۔۔۔۔" رستوگی نے
لبوں پر چڑھا کر کہا۔

وجے اپنے ذہن میں ماضی، حال اور مستقبل کا تصور کرتا کرتا
جب کمرے میں پہنچا تو زیر لب مسکرانے لگا لیکن نہ جانے کیوں وہ اچانک
ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

(۴)

کنٹریکٹ ہو چکا اور وجے سے دس ہزار کی رسید لے کر کل بارہ سو روپے ملے ۔ جب کہ نئی اداکارہ مس ایل کو دس ہزار کا رسید لے کر اسّی ہزار روپے ملے ۔ وجے کے جسم پر بجلیاں گرنے لگی ۔ لیکن وہ پھر بھی خاموش رہا فقط ایک نئی سحر کی اُمید میں ۔

(۵)

آج سکرپٹ کی ایڈٹنگ ہونے والی تھی ۔
اور کمرے میں کوئی دس آدمی شاندار صوفوں پر بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی بیر کی چسکیاں لے کر وجے کا انتظار کر رہے تھے ۔

"ونڈرنل ۔ ونڈرنل ۔ سنہا صاحب آپ کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکتا ۔"

"رائٹر اور اپنے آپ سے بے خبر ——— اجی میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مسلمان ہے تو ضرور مرزا غالبؔ کی پشتوں میں ہے اور اگر ہندو ہے تو میرا اندازہ ہے کہ یہ بندہ کالیداس کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور کالیداس بننے والا ہے شکل ہی بذاتِ خود اس کا ثبوت ہے ۔"

"جی آپ کا اسم شریف ؟"

"وجے ۔ وجے کمار شرما ۔"

"دت تیری کی۔ یہ کمار کب سے ادیب بننے لگے " کو
پروڈیوسر اوم سنہا نے اپنے گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔
" نام تو آپ کو بدلنا پڑے گا۔" فائنسر کھنڈاری ایسے
بولنے لگا۔ جیسے وہ فائنس کرنے کی یہ شرط رکھ رہا ہو۔
" نام بدلنے سے کام تو نہیں بدلتا...... میرے عظیم دوست
گلاب کا نام کمل رکھنے سے کیا اس کی خوشبو بدل سکتی ہے.......
ہاں تو سکرپٹ....." وہ ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ
بولنے لگا۔
کچھ دیر کے لئے کافی بحث ہوئی تو ایک مہمان نے بار بار
سہنا کی طرف دیکھ کر ایک کاغذ آگے بڑھا کر کہا۔
"بھئی ویسے سرمایہ فلمی دنیا ہے۔ یہاں ہر چیز نام پر چلتی ہے
اس لئے ان ناموں میں سے کوئی نام (   ) کرو۔ جبری۔
فیض عباس تاکہ لوگ غلطی سے تمہیں سردار جعفری، فیض احمد
فیض یا خواجہ احمد عباس سمجھ کر تمہاری قدر کریں...... یا.... یا۔
یا اپنا نام جادوگر کاشمیری رکھ دو۔"
" نہیں۔ نہیں۔ ساحر کشمیری ٹھیک ہے کاسٹ میں ساحر
بڑے حروف میں لکھیں گے کشمیری چھوٹا لکھ دیں گے۔ یا ساحران
کشمیری بھی لکھ سکتے ہیں۔" سنہا کا لنگوٹیا یار مسحرا لیلا تشنکر سنجیدہ
ہو کر بولا اور پھر اپنی لمبی ناک کی نمائش کرکے لوگوں کو ہنسانے

میں کامیاب ہوا جس کا فائدہ اٹھا کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر رام کمار اپنی سیٹ سے فوراً اُٹھ کر مس ایلی کے پاس بیٹھ گیا۔ لیکن جب وہ بگڑ گئی تو رام کمار کو تحفہ وجہ پر ہی آنے لگا جو ایک کونے میں بیٹھا۔ گم سم اپنے خیالات میں پریشان تھا اور آہستہ آہستہ اپنے سکرپٹ کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

" فلم کا نام کیا ہے ؟" ستہا نے اپنے نوٹ بک میں کچھ درج کر کے پوچھا۔

کلائی سحر (THE DAWN OR THE DARKNESS)

" نہیں - نہیں - خواب میں رگھو ناتھ والے سوامی نے مجھے ہدایت دی ہے کہ فلم کا نام فقط لفظ (س) سے شروع ہونا چاہیئے" مسز سنہا نے اپنے خاوند کو مشورہ دیا " میرے خیال میں ستہ داں ساوستری رکھ دیجیئے یا فقط ستوان ..."

" کبھی سرخ سویرا کیسا ٹائیٹل ہے " سنہا نے اپنے تجربے کا فائدہ اٹھا کر کہا۔

" میں پوچھتا ہوں کیوں میری کہانی کا وجود ختم کیا جا رہا ہے " وجے چلا اُٹھا۔

" یا پھر سنہری سہرا ..." سنہا نے وجے کی طرف دھیان نہ دیتے ہوئے کہا۔

" یہ اچھا ہے کیونکہ ہمارے شاعر صاحب نے کل ہی ایک

خوبصورت گیت سنہری سہرا سے شروع کر کے لکھا ہے..... گانا یوں ہے۔

سنہری سہرا —— گیٹ یہ میرا —— دل وہ تیرا ۔ کل ہے دسہرہ ۔

گانا تین سچوئیشنز —— پر چلے گا۔ ایک کاسٹ کے ساتھ ایک کلائمکس پر اور ایک آخیر میں.....“ میوزک ڈائرکٹرز رام ناتھ شام ناتھ ایک ساتھ ایسے بولنے لگے جیسے خبروں پر تبصرہ نشر ہو رہا تھا۔

”درست ۔ آپ کی ڈاکیٹے سر آنکھوں پر “۔ سنہلتے خوش ہو کر کہا۔ بس پر رام ناتھ و شیام ناتھ انگلیاں بجاتے کچھ ہلکے شروں میں اپنی سدھ بدھ کھو کر ایسے گنگنانے لگے جیسے بس ایلی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں اس کی نیم عریاں چھاتی کو دیکھ رہے تھے۔

لیکن میری کہانی میں تو کسی بھی گانا کی سچوئیشن نہیں ہے!“

کچھ دیر بعد کافی غور خوض کر کے جب سکرپٹ فائنل شیپ میں سنہلتے پیش کیا تو فلم میں دس گانے تھے۔ تین بکّے گانے تین دو گانے ایک فیملی پلاننگ پر۔ ایک قومی ترانہ ایک بھجن اور ایک کلب کا گانا جو ایران سے منگوائی ہوئی دو رقاصوں پر فلمانا تھا۔

”یہ گانے تو میری کہانی میں نہیں آ سکتے ۔ میرے پلاٹ کو ذبح نہ کیجیے“ وہ بغاوت پر آمادہ ہوا۔

بکو مت کہانی میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ سنئے صاحبان ہیرو جیوتی بچپن میں ایک جیب کترا ہوتا ہے اور وہ بھی ایک ایرانی رقاصہ کے پیار کی خاطر۔ لیکن جب وہ اُسے ٹھکراتی ہے تو جیوتی کالج میں ایک پروفیسر بن جاتا ہے۔ جہاں اُس کی ملاقات ہیروئن سے ہوتی ہے جیوتی پھر اچانک غریب بن جاتا ہے اور آخیر میں انقلابی اور وہ ایرانی رقاصہ بھی دراصل ہیروین ہی ہوتی اور ولن ایک خوانچے والا نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی ہوتا۔ اور کشمیر میں رہتا ہے وغیرہ وغیرہ ..... تو ...... تو یوں سب گیتوں کی سچویشن بھی نکل گئی اور فلم کے (TEMPO) کی سکوپ نظر آنے لگی۔"

سنہلنے ایک فاتح کی طرح ایسے بیاں کیا جیسے وہ چاند کی سیر کر کے ایک پریس کانفرنس پر تقریر دے رہا ہو۔

"یہ قتل ہو رہا ہے میرے پلاٹ کا، میری عبادت کا..... ذرا سوچئے حاضرین۔ میرا ہیرو بچپن سے غریبی کا شکار تھا۔ اُس کی زندگی تلخ تھی۔ ماں دق کی مریض اور بیوی کینسر کی شکار، پھر ایرانی رقص ۔"

وجے بے قابو ہو کر پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔

"کیوں نہ فلم کا نام ہی ایرانی رقاصہ رکھا جائے"۔ مس لِلی نے دانتوں تلے ساڑھی دباتے ہوئے کہا۔ مسٹر رام کمار نے داد دینا چاہی لیکن وجے چلا رہا تھا۔

"گاؤں میں ایرانی رقاصہ آئے - ہیروین بن جائے تو یہ بھی دکھلائے کہ ہیرو کا گھرا قل ٹا ور پر تھا اور ہیروین مصر کے پیرامڈس پر گھوڑوں کو گھاس چراتی تھی - لیکن مارٹن لوتھر کے قتل کے بعد بھارت اگر ہیرو کو انقلابی بننے سے روکتا ہے - اور کر لیجئے دفن میرے اُس پلاٹ کو جس میں میرا لہو سیاہی نہیں" وہ کہہ ہی رہا تھا کہ میٹنگ برخاست ہوئی اور اُس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر فقط اُسے ہی سُنائی دینے لگی -

(۶)

تو یوں قلم سے کیمرے تک یا روشنائی سے سلولائیڈ تک ہوتا گیا - اور جب فلم ریلیز ہو گئی تو فلم کا نام - "سنہری شام یولو رام" تھا اور کہانی کار کا نام دولمان" ہو گیا تھا - فلم رنگین تھی - ہیرو پہلے سادھو پھر جیب کترا - پھر رومانٹک ٹرِبجسڈین - اس کے بعد غریب ہو کر اشوکا ہوٹل میں ہیروین کے ساتھ کھانا کھاتا - گھر میں نوکروں کی قطار جن میں ایک کا رول مسخرا لیلا شنکر ادا کر رہا تھا - جو اپنی موٹی بیوی سے لڑتے لڑتے ایک دن اچانک ولن بن بیٹھا - ہیروین کا ٹریل رول ...... پھر کشمیر سے لے کر

کنیا کماری تک کے مناظر اور ایرانی رقص وغیرہ۔

فلم ہٹ ہو گئی۔ ہیرو ہیروئن کا مارکیٹ تیز ہو گیا۔
لیلا تشنکر پروڈیوسر بن گیا۔ سنہا نے ایک ساتھ دو تین فلموں
کی شوٹنگ شروع کی لیکن وہ جے نہ جانے کہاں کھو گیا۔!

مُنے کی دوکان شہر کی ایک جانی پہچانی دوکان ہے۔
چند ماہ پہلے جب دوکان کا جوان مالک ایک ٹرک کے نیچے کچلا گیا۔ تو بازار والے تو کیا منّا کی ماں بھی یہی سمجھنے لگی۔ کہ یہ مشہور دوکان اب ایک ایسے چراغ کی مانند ہے۔ جس میں تیل تو ہے لیکن باتی نہیں۔ لیکن منا نے چراغ پھر سے روشن کیا اور اب دوکان کے کافی چرچے ہو رہے ہیں۔
دوکان میں کوئی خاص کشش تو نہیں ہے۔ لیکن مُنا عام دوکانداروں سے بالکل مختلف ہے۔ شکل و صورت سے بھولا بھالا۔ اپنے سکول کی مخصوص وردی پہنے ہوئے چھوٹے سے قد کا یہ کم عمر لڑکا باتیں ایسے کرتا تھا جیسے ۶۰ سال کا تاجر

اپنی تجارتی کشمکش کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

" جناب۔ بڑے شہروں میں بڑی دوکانیں ضرور ہوتی ہیں۔لیکن بڑھیا مال کہیں نہیں ملتا۔ میری دوکان آپ کی اپنی دوکان ہے۔مال اعلا قسم کا ملے گا اور دام بھی واجب ہوں گے۔ دیکھیے یا تو آپ یقین کیجیے یا آزمائیے۔ ہاں دوکان کا نام مت بھولیے گا۔ " منّا پراڈ اینڈ یعنی منّے کی جنت"

چھوٹے منہ سے بڑی بات یوں تو ناقابل برداشت ہوتی ہے۔لیکن گاہک اس دکان پر چھوٹے منہ سے بڑی بات سننے کے لیے ہی آتے ہیں شاپنگ کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی تفریح ہی اس دوکان کی کامیابی کا راز ہے۔

یوں تو الفاظ کچھ بھی ہوں۔ مکالموں کا مفہوم کچھ بھی ہو۔ تلفظ درست ہو یا نہیں۔ مواد معقول ہو یا بیہودہ یہ جاننے یا سمجھنے کی شاید ہی کسی کو فکر ہے۔ مگر ریاضی کے پہاڑے کی طرح رٹے ہوئے مکالمے اور ان کی ادائیگی ہی تفریح کا ایک خزانہ ہے۔کچھ لوگ تو دانستہ طور پر اس کی باتیں سننے میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ بس دن میں تین چار بار آتے ہیں۔ادھر ادھر کے سوال پوچھ کر اُسے رٹے ہوئے مکالموں کو اُگل دینے پر مجبور کرتے ہیں۔گویا وہ ایک ۱۱ سال کے بچے کے پاس نہیں بلکہ ایک پیشہ ور مسخرے کو اُکسا کر مزاحیہ مکالمے سننے آتے ہیں۔

"جناب یہ کرتہ آپ خرید لیجئے۔ واہ واہ!!
آپ کا راجیہ بیٹا راجیش کھنہ بن جائے گا۔ اپن بھی ہیرو بن
جاتا۔ مگر کیا کریں۔ مالک اپنا چہرہ اچھا نہیں۔ دیکھئے بالکل بندر
لگ رہا ہوں۔

"یہ لال چوڑیاں لیتے جائیے۔ بالکل سستا مال ہے۔ خود
پہن لیجیے۔ دوستوں کو پہنا دیجیے۔ بلکہ پڑسیوں کو بھی عطیہ دیں
کسی کو کیا معلوم، کہ منا نے آپ کو رعایت کی ہے"۔

"اجی صاحب قیمت کی بات ہی مت کریں۔ یوں سمجھ
لیجئے سونا مٹی کے بھاؤ دے رہا ہوں"

"ارے دادا آپ کی چیز ڈھونڈ نکالی ہے۔ میں نے!
واہ واہ کیا دلکش پیور ہیں۔ دیکھتے ہی۔ پٹاخے پھٹ جائیں گے۔
اس وقت دکان پر لیڈی ہیں۔ شام کو تشریف لائیں"۔

منا کبھی ڈرامائی انداز میں اپنے مکالمے با آواز بلند بولتا ہے
کبھی سرگوشیانہ انداز میں جیسے کوئی راز کی بات کر رہا ہو۔
یہ طرز بیان اور یہ مکالمے اس کے اپنے نہیں ہیں۔ بلکہ چرائے
ہوئے بھی نہیں۔ جیسے دوکان ورثے کی ملکیت ہے ویسے یہ
دوکانداری کے طور طریقے بھی اپنے ابا کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ وہ
اکثر ایک لاڈلے بچے کی طرح اپنے باپ کے ساتھ چپکا رہتا تھا۔
اور اس کی باتیں سنتا رہتا تھا بس اب وہی باتیں دہرا کر

وہ اپنی تجارت کو فروغ دینے میں کامیاب ہوا ہے لیکن وہ اپنی اس زبردست کامیابی پے قطعی ناآشنا ہے۔

مگر گاہک اُسے ایک سلجھا ہوا دوکاندار سمجھتے ہیں۔ گو وہ تجارتی داؤ پیچ سے بالکل واقف نہیں۔

"صاحب ـــــ وہ چیز کالوٹوں یا نہیں"

کیا کمائی ہے صاحب ـــــ دوکان کا کرایہ۔ بجلی کا خرچہ۔ سرکاری ٹیکس غیر سرکاری ٹانکے۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔ مشکل سے بچوں کا پیٹ پلتا ہے۔

"آؤ مالک ـــــ"

"ان داتا ـــــ صبح سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں"

"بیٹھئے جی آپ کے لئے کیا منگواؤں چائے یا کچھ ٹھنڈا"

کبھی کبھی اُس کے غیر ضروری مکالمے غیر مناسب ہوتے ہیں۔ اور گاہک چونک جاتا ہے کہ یہ تمہید کیوں باندھی جا رہی ہے۔ لیکن اس کی بلا سے وہ جب بھی شروع ہو جاتا ہے۔ تو رکنے کا نام بھی نہیں لیتا۔ لیکن جب سڑک پر اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ تو وہ اچانک ایک تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ مایوسی اس کے چہرے پر قابض ہو جاتی ہے اور وہ بولتے بولتے ایسے رک جاتا ہے۔ جیسے امتحان ہال میں بیٹھے بیٹھے کوئی رٹا ہوا سوال بھول گیا ہو۔

یہ ایک فطری تقاضہ ہے جس سے لوگ واقف نہیں۔

"کیا بات ہے مُنا کچھ کھوئے کھوئے سے لگتے ہو۔

"کچھ نہیں جناب ..... دن بھر یک یک کرتے کرتے شام کو تھک جاتا ہوں لیکن .... لیکن آپ حکم کریں ..... کیا پیش کروں ..... کوئی نئی قسم کی تاش کریم پوڈر ......"

وہ بولنے کی کوشش تو کرتا ہے۔ لیکن ان مکالموں میں گو وہ کشش نہیں ہوتی ہے جو دِن کو ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی گاہک ہنستے رہتے ہیں اور وہ کیوں نہ ہنسیں ..... ایک مکالمے کی سطر دوسرے کے ساتھ جڑ جاتی ہے اور دوسرے کی تیسرے کے ساتھ۔ مکالموں کا یہ اورلیپ بھی ایک دلچسپی کا موضوع ہے جیسے عام طور پر کالج کے لڑکے لڑکیاں تقریباً روز ہی شام کے وقت آتے رہتے۔ مُنا اُن کی بات اِن کو اور اِن کی بات اُن کو ایک بے لاگ تبصرہ کی طرح سناتا ہے اور اُس کے مکالمے پیغام رسانی کا کام بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ اسے نہ تو اُن کی باتیں سمجھ آتی ہیں اور نہ ہی اُس میں سمجھنے کی اتنی صلاحیتیں ہیں اتنا وہ ضرور جانتا ہے کہ دوکان سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہیں اُترتا۔ اور بکری دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔

"یہ لیجئے آپ کا ۳۷ - ۳۶ سا بیٹر"

"یہ رہا آپ کا لال نکوت"

"بال صاف کرنے والی کریم کل آئے گی"

"میرو کھائی۔ یہ خط لیجئے اور سیتیٹ کے پیسے دیجئے۔ اور ہاں فرائیش فارن لپ اسٹک کی بھی ہے کہو تو کل دیدوں۔"

"بہن جی ان کو سویٹر پسند نہیں آئی۔ کہو تو کل کوئی اعلےٰ چیز پیش کروں۔"

آج لڑکیاں دوکان سے اترتے کا نام نہیں لے رہی ہیں اور وہ بیچارہ پریشان ہے۔

سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے بجلی کے قمقمے دیکھ کر اس کا سانس رک جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ہمت کرکے کچھ نہ کچھ بولتا جا رہا ہے۔

گھڑی نے سات بجا دئے تو وہ بولتے بولتے ایسے رک گیا جیسے کسی نے ریڈیو کا پلگ نکال دیا ہو۔ لیکن اگلے ہی لمحے چہروں کے اس گھنے جنگل میں ایک جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں گویا ایک تھکے ہوئے بھٹکے راہی کو جھاڑیاں صاف کرتے ہی ایک ہموار راستہ نظر آیا ہو۔ بس اس عورت کو دیکھتے ہی وہ جوش و خروش سے مکالمے بولتا رہا جیسے ایک ٹیپ ریکارڈ میں کمزور بیٹری کو نکال کر ایک بہت ہی طاقتور بیٹری لگائی گئی ہو۔ مختاہی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا۔ بکری کرتا رہا گاہکوں کی تفریح کرتا رہا اور وہ عورت اسے گھور گھور کر دیکھتی رہی۔

"کل اور آج میں کتنا فرق ہے۔ حال ماضی کو دھکیل کر کتنا

روشن ہے چھٹی جماعت کا ڈرپوک طالب علم جو کل تک اپنی کلاس لڑکوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوتا تھا۔ بازار میں ہجوم دیکھ کر اپنے باپ کے ساتھ چپک جاتا تھا آج دن بھر اکیلا دکان پر بیٹھا رہتا ہے ایک بزدل لڑکا جس پر دوسرے لڑکوں کی لڑائی جھگڑے دیکھتے ہی بے ہوشی طاری ہوتی تھی۔ آج کسی بھی گاہک سے مقابلہ کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے ایک خاموش لڑکا جو گھر والوں کو بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہتا تھا۔ آج خالص تجارتی طرز کی گفتگو کرنے میں ماہر ہے۔ شام ہوتے ہی جو اندھیرے تاریکی سے خوفزدہ ہوکر ماں کی گود میں چھپ جاتا تھا۔ آج رات گئے دکان بند کر کے دن بھر کی وٹک لئے اکیلا گھر جاتا ہے "منا کو دیکھ وہ بہت خوش ہو رہا ہے اور خوشی بھی اتنی کہ آنکھیں اشک بار ہو گئی ہیں۔

جب سارے گاہک چلے گئے تو دوکان پر فقط یہی عورت رہ گئی ہے۔ وہ تنہا ہے اور بہت ہی خوبصورت۔ منا اس کے چہرے کو دیکھ کر خوشی سے اچھل رہا ہے اور اسے نت نئی چیزیں پیش کر رہا ہے۔

"یہ بھی رکھ لو کام آئیں گے"

"یہ شال بھی لو"

"ایک ڈبے سے کیا بنے گا پورا درجن لو"،

یہ نیلے رنگ کی سویٹر آپ پہن لیں گی تو بہت اچھی

لگیں گی آپ ..... "

عورت کبھی کچھ احتجاج کئے بغیر خریدا کرتی رہی۔ ڈھیر سا مان کاونٹر سے ایک ایک کرکے وہ جب اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پیک کرنے لگا۔ تو اس کی ناک بہتی رہی۔ اپنے آستین سے صاف کرتے ہوئے وہ کبھی اپنی شرمندگی کے احساس کو چھپانے کی خاطر مسکراتا رہا اور کبھی پھیکی مسکراہٹ کے نیچے اپنے چہرے کے حقیقی تاثرات چھپاتا رہا۔

سامان پیک کرکے وہ اپنے انجہانی باپ کی طرح لفافوں پر رقم جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ناکام ہوکر وہ کاغذ کے ایک ورق پر رقم یوں جوڑنے لگا۔ جیسے ریاضی کا سوال حل کررہا ہو۔ اور جب وہ رقم جوڑنے میں کامیاب ہوا بازار کی ساری دوکانیں تقریباً تقریباً بند اور سڑک مکمل تاریکی کا لبادہ اوڑھنے لگی۔

"پھر کبھی تشریف لائیے گا۔ دوکان کا نام یاد رہا نا۔ "ممتا پراڈیشر یعنی ممتا کی جنت"

دونوں کھل کھلا ہنس پڑے اور عورت پرس میں بچی ہوئی ریزگاری رکھتے ہوئے چل پڑی۔

ممتا ہنستے ہنستے اچانک رو پڑا۔ وہ اس عورت کو روکنا چاہتا ہے۔ اور وہ بے چینی سے ٹیکسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ممتا گھبرا گیا۔

"اب کیا کروں۔ میرے سے اب دوکان کا شیشہ کبھی بند نہیں ہو پائے گا۔" وہ ساتھ والی بند دوکان کو دیکھتا رہا۔ ان تاریک گلیوں میں کون میرا ساتھ دیگا وہ تاریک سڑک کو دیکھ کر سوچنے لگا۔

اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ اس عورت کی جانب اس تیزی سے دوڑنے لگا۔ جیسے کوئی جن یا کلبوت اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

"ڈیڈی ..... ڈیڈی ..... رُک جاؤ .... رک جاؤ ..... مجھے ڈر لگ رہا ہے .... مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

وہ دوڑتے دوڑتے چلّا رہا تھا۔ لیکن ٹیکسی اسٹارٹ ہو کر تیزی سے موڑ کاٹ کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔ بالکل ویسے ہی جیسے راکھ کے ایک ڈھیر کے نیچے اس کا باپ غائب ہو گیا۔

گئی رات وجے نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو دیوار پر ایک لمبا سا آ

اُچھل رہا تھا۔

"اُف! - دن ہو یا رات - دادا یوں ہی کمرے میں ایک گھڑی کی
سوئی کی طرح چکر لگاتا رہتا ہے۔ تھک بھی نہیں جاتا - یہ دادا کس
مٹی کا بنا ہوا ہے۔ دادا کی نیند اُڑ گئی ہے یا وہ سونا نہیں چاہتے -
دادی اچھی تھی - مگر مر گئی بے چاری اور اس چنچل تور کو پیچھے چھوڑ گئی۔
دادا میرے ڈیڈی کا ڈیڈی ہے - اور اس بوڑھے نے اگر مجھے
آج پھر اس حالت میں دیکھا تو طوطے کی طرح ڈیڈی کو سنا دیں
گے - چشم دید گواہ کا بیان اور ڈیڈی کا فیصلہ ——— اُف ا———"
اپنے ڈیڈی کا خیال آتے ہی وہ فرش پر یوں بیٹھ گیا - جیسے زلزلہ

آیا ہو ـــــ وہ اپنے ڈیڈی کے قدموں کی آہٹ سے بھی آشنا ہی
واقف ہے جتنا اُن کے غصّے کے قہر سے ! ـــ تبھی ــــ جب کمرے
میں اس کے ڈیڈی کی آواز گونجنے لگی تو وہ ایک لفظ یوں سنتا رہا
جیسے ایک مجرم عدالت کا فیصلہ سن رہا ہو۔ آواز صاف صاف
سنائی دے رہی تھی۔

" بالوجی ! ـــ کئی بار کہہ چکا ہوں کہ آج کی سوسائیٹی ایک
ایسی کتاب نہیں جس کو حجابوں کے پیچھے چھپایا جائے۔ بلکہ یہ وہ
تحریر ہے جو سرِ عام پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں
ہم سب اپنا عکس دیکھ کر اپنا اپنا مقام ڈھونڈ سکتے ہیں ـــ
یہ عکس خیالات کا عکس ہے۔ یعنی ریفلکشن آف تھاٹ Reflection
of thought)۔ آپ کا خیال ہی جب پُرانا ہے تو عکس نیا
نہیں ہو سکتا۔ آپ کی کہانی ایک بھولی بسری داستان ہے ـــ
پتھر کے انسان کی کہانی یا آپ کی حکایتیں سُنی جا سکتی ہیں۔ پڑھی
جا سکتی ہیں مگر ـــ چھوڑیئے بالوجی ـــ رواج ـــ
دستور ـــ وقت کے ساتھ اپنا رنگ ڈھنگ آکار بدلتے رہتے
ہیں ـــ ہاں ـــ ہاں ـــ بالوجی ـــ ! ـــ آپ کا
یقین کھوکھلا ہو چکا ہے ـــ مگر اس میں میرا قصور نہیں ـــ
وقت کی نوک نے کُریدا ہے اُسے ! ـــ کون کہتا ہے شراب
شباب ... محفلیں ... شان ... [illegible]

مغربی رسم و رواج کا اثر ہمارے معاشرے کو گدھ کی طرح نوچ
رہے ہیں۔ لیکن گدھ مردہ جسم کو دیکھ سکتا ہے زندہ جانور یا انسان
کو نہیں ـــــ ہمارا معاشرہ مر ہی کب گیا ہے جو اس کو نوچ
لیں ؟ ـــ ہا ـــ ہا ـــ آپ کو ہر چیز مختلف نظر آ رہی
ہے نا ؟ ـــ وہ اس لئے کہ آپ کا نظریہ مختلف ہے۔
روشنی آگے ہو تو سایہ پیچھے ہوتا ہے ـــ روشنی پیچھے ہو تو
سایہ آگے ہوتا ہے ـــ نئی سحر نئے دن کا آغاز ہے اور پچھلا
کل ایک ایسا پڑاؤ ہوتا ہے جہاں سے گزر کر پھر واپس لوٹنا
سراسر نادانی ہے ـــ اور پھر کل کی زندگی فرسودہ خیالات کے
گھسے پٹے پہیوں پر رگڑ رگڑ کر چلتی تھی ـــ ڈرتی ڈرتی ـــ
ڈگمگاتی ـــ لرزتی ہوئی ـــ ہانپتی ہوئی ـــ سسک
سسک کر ـــ سست رفتار پر ـــ امنگوں اور ارمانوں
کو پیچھے دھکیل کر ـــ بے بسی کو ہم سفر بنا کر ـــ پیدل چلنے
والے مسافر کو گھوڑا بھی ہوا میں اڑتا ہوا نظر آتا ہے ـــ
"کل" ہے نہیں ـــ وہ "تھا" ـــ
ـــ ہے ـــ "آج" ہوگا نہیں ـــ وہ "ہے" اور آپ
کے سامنے ہے ـــ ایک دِل کش بت کی طرح نہیں۔ بلکہ
ایک نئے دور کی شکل میں ـــ مشکل تو یہ ہے کہ آپ آنکھیں
کھول کر بھی سوئے ہیں ـــ وقت کی کروٹیں بھی اگر آپ

کو نہیں جگا سکتی تو میں کیا کر سکتا ہوں ـــــ آپ کی تو سوچ ہی غلط ہے ـــــ !

بالوجی ـــ ! ـــ میں آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچا رہا ہوں ـــــ فقط یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ سمندر کے کنارے بیٹھ کر جنم جنم سے وہی آتی جاتی پانی کی لہریں دیکھنا ہی اگر زندگی کا مقصد ہوتا تو ہم بار بار کیوں جنم لیتے ـ صدیوں کے ساتھ دور کیوں بدلتے ـــ ؟ ـــ آپ کی سوچ سے جمود کا آغاز ہو سکتا ہے ـ یعنی زندگی کی وہ منزل جہاں خواہشات کا دائرہ ایک نقطہ بن جاتا ہے ـــــ یعنی فُل اسٹاپ !! ـــــ کہانی ختم !

بالوجی ـــــ سمندر میں کود کر پانی کی گہرائی کا اندازہ لگانا اگر زندگی کا مقصد نہ ہوتا تو آپ کے بعد میں پیدا نہیں ہوتا اور میرے بعد میرا بیٹا پیدا نہیں ہوتا ـــــ جو آپ نے دیکھا ہے وہ ایک حد تھی ـــــ جو میں دیکھ رہا ہوں وہ دوسری حد ہے ـ اور جو وہ دیکھے گا وہ ایک نئی حد ہو گی ـــــ نہیں ـــــ نہیں ـــــ بالوجی ! ـــــ یہ فلسفہ نہیں اور نہ ہی اعمال کی وکالت ہے ـــــ یہ ایک حقیقت ہے جسے میں نے قبول کیا ہے اور آپ کو بھی قبول کرنی چاہیے ـــــ ورنہ ـــــ ورنہ بالوجی ! ہمارا کارواں زندگی بکھر کر ایک ہجوم بن جائے گا اور ہم اپنا وجود تلاش کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہیں گے ـ

با ___ لو ___ جی ___ اگر آپ اب بھی میری بات نہیں سمجھ لیتے تو یہ موٹی بات تو سمجھ لیجیے کہ میں پنڈت دوارکا ناتھ آپ کا بیٹا ضرور ہوں مگر کرشن لال شرما بھی تو ہوں ___ ہاں ___ ہاں ___ میں ٹھنتا نہیں ___ ۴۰ سال کا ایک سمجھدار انسان ہوں ۔ جسے نہ تو انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت اور نہ ہی کان پکڑ کر سکھلانے کی ضرورت ہے ___ پہیلیاں سنا کر ڈرانے کی ضرورت نہیں ۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ___ کر چکا ہوں ___ یا کروں گا وقت کے قدموں کے قدموں سے قدم ملا کر ہی کروں گا ۔ مجھے اپنا راستہ صاف صاف نظر آ رہا ہے ۔ دور دور تک ۔ سمندر پار تک ___ مشرق سے مغرب تک ___ شمال سے جنوب تک ___ آپ کا راستہ دھندلا ہے یا پھر آپ کی نظر کمزور ہے ۔ سوچ کمزور ہے جو بیمار بھی ہو سکتی ہے ___ شاید اس لئے آپ فقط میرے بارے میں سوچتے رہتے ہیں ۔ میرے دوستوں کے بارے میں سوچتے ہیں ___ مسز کول کے بارے میں سوچتے ہیں ۔

پھر خاموشی چھا گئی اور وجے نے اپنے سوکھے ہوئے حلق کو تر کرتے ہوئے پھر جیب کمرے میں جھانک کر دیکھا تو دیوار پر دو سائے اُچھل رہے تھے ۔ ہو بہو ایک جیسے ___ وہی ناک نقشہ ___ دو انسان ___ مگر مختلف سوچ ۔ دروازہ بند ہوا تو دیوار پر ایک ہی سایہ نظر آیا ۔

ایک جگہ کھڑا ——— بالکل ایک بے جان بُت کی طرح خاموش!
جو کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے چھت پر لٹکے ہوئے لیمپ کی حرکت
کے ساتھ یوں اُچھل رہا تھا جیسے کوئی شخص دلدل سے نکلنے
کی جدوجہد کر رہا ہو ——— وجے خوشی سے چلانے لگا ———
"واہ! ——— واہ!! ——— آج دادا کی بولتی بند ہو گئی ——!
دادی کی آواز ملبے کی نیچے دب گئی ——— اور دادا ——— ہاہا ———
کھنڈر بن گیا ——— کھنڈر کچھ بیان کر بھی دیں تو کوئی کر بھی
لیتا ہے! ——— چغلی ڈر کی چغلی اگر کوئی سنے ہی نہیں تو ڈر کس
بات کا ——— ہاہا ——— ہاہا ———"
اُس کی خوشی مسرت کی حد کو چھو کر جنون کی شکل اختیار کر گئی
اور ٹریجڈی زندہ یاد کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جانے لگا مگر لڑکھڑاتا
ڈگمگاتا ——— دیوار کے سہارے گرتے سنبھلتے ہوئے جب وہ
دروازے تک پہنچ گیا تو کسی چیز سے ٹکرا کر ایک گیند کی طرح دور
جا گرا ——— وہ دروازے کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے باپ کے
سینے سے ٹکرا کر نیچے گر چکا تھا۔ کرشن لال اپنے بیٹے کو دیکھ کر آہستہ
آہستہ یوں چلتا رہا جیسے ایک جلّاد مجرم کے گلے میں پھندہ ڈالنے
کے لئے پیش قدمی کر رہا ہو۔ وجے کا آدھا نشہ اُتر گیا۔ سر پر گویا
کوئی ہتھوڑے مارنے لگا۔ تو اپنے باپ کی معنی خیز نگاہوں میں
مستی کولی کے چہرے کا عکس صاف دکھائی دیا۔ اور نظر آیا "تو کیا ٹریجڈی

نے ہمیں دیکھا تھا" وہ سوچتا رہا۔
وجے کی حالت بہت بُری تھی۔ اپنی ہی اُلٹیوں سے اُس کے
سارے کپڑے گندے ہو چکے تھے۔ اور اس کی پلکیں اب بھی
نشے کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں تھیں۔ نشے اور ڈر کی وجہ سے
اس کی زبان ایک ٹوٹے ریکارڈ کی طرح رُک رُک کر چل رہی تھی۔
لیکن پھر بھی اپنے بچاؤ کے لئے کئی بہانے تراشے مگر اس کا ہر بہانہ
کرشن لال کے غصّے کے شعلوں سے راکھ ہوتا گیا۔ اور آخر وجے مان
گیا۔ شاید اس لئے کہ غلطی کا اعتراف ہی معافی کا ایک معقول بہانہ
بن سکے۔ مگر وجے نے کیا کیا ہے۔ کونسا جرم یا گناہ !
اُس کی ماں سوچتی رہی وجے شراب پیتا ہے۔ کلب جاتا
ہے۔ ہوٹلوں میں کیبرے دیکھتا ہے یہ سب اس کا باپ جانتا
ہے اور اطلاع بھی وجے کی ماں نے ہی دی تھی مگر آج —— اف
وہ پریشان بھی تھی اور حیران بھی تھی۔ کرشن لال کے ہاتھ پاؤں
یوں چلتے رہے جیسے کسی گھمسان جنگ میں گولیاں بارود بم۔
میزائلز چل رہے ہوں۔ لیکن اچانک ایک دھماکہ ہوا ——
وجے کی ماں چیخ پڑی۔ وجے کے بھائی بہن رونے لگے۔
دیوار کا نقشہ کے ہونٹ تھر تھر کانپنے لگے۔ نوکر بے بس کھڑے
رہے اور کرشن لال صوفے سے ٹکراتا ہوا فرش پر یوں گر گیا
جیسے ریت کی دیوار ..... وجے اپنی ناک سے بہتا ہوا خون

اپنے الٹے ہاتھ سے صاف کرتا ہوا ایک فلمی ویلن کی طرح بولنے لگا پورے اعتماد کے ساتھ۔ اُسی اعتماد کے ساتھ جو کرشن لال نے بچپن سے ہی اُس میں پیدا کیا تھا۔ تقریر سے۔ تحریر سے۔ عمل سے۔ تبھی اس کی آواز گرج دار تھی۔

"ڈیڈی! — ڈیڈی —!! میں سمجھ رہا تھا کہ آپ سمجھ دار ہیں مگر آپ کی سمجھ ہی نا سمجھ ہے۔ خوبصورت کپڑے سے لپٹی ہوئی زنگ آلود فولاد کی طرح! وقت نے جب ایک اور کروٹ لی تو کیا آپ بے ہوش تھے! — ڈیڈی جو تھا اگر وہ ایک داستان ہے جو ہوا ہے اُسے آپ حادثہ کہتے ہو — واقعہ نہیں لمحے کی بھول نہیں لمحات کی سوغات نہیں — آپ آج کی بات کر رہے ہیں کل کی۔ بات کیجئے — ڈ — یڈ — ڈی — ! — میں شری کرشن لال شرما کا بیٹا ضرور ہوں — مگر وجے بھی تو ہوں۔ وجے کمار۔ میری اپنی شخصیت ہے — انا ہے — آرزوئیں ہیں — اُمنگیں ہیں — اگر مسز کول آپ کی دوست اس لئے ہے کہ وہ آپ سے عمر میں بڑی ہے۔ وہ جب آج میری انگلی پکڑے گی تب میں کسی کا ہاتھ پکڑ سکتا ہوں۔ اور پھر دوستی دوستی ہے۔ شادی شادی ہے۔ رشتہ رشتہ ہے۔ ناطہ ناطہ ہے — ممی کبھی آپ کی بیوی ہے (Better Half) اور مسز کول دوست — گرل فرینڈ — ا — چھوڑیئے ڈیڈی ان باتوں میں کوئی دم

بیتیا۔ بچہ نہیں ۔۔۔ ۱۸ سال کا نوجوان ہوں ۔۔۔ میرا امریکن دوست مجھ سے دو سال چھوٹا ہے اور وہ اپنے ڈیڈی سے الگ رہتا ہے۔ اپنی فرینڈ کے ساتھ ۔۔۔ کیوں چونک گئے ؟ ۔۔۔ ہا ۔ ہا ۔۔۔ ہا ۔ ہا ۔۔۔ ہو ۔۔۔ ہو ۔۔۔ ہو ۔۔۔ میرا گھوڑا آپ کے گھوڑے کو مات کر گیا۔ گھوڑے کے یہ ڈھائی قدم کی جنریشن (Generation) کی چال ہے ۔۔۔ ڈھال ہے ۔۔۔ لمحے کی سوغات ہے ۔۔۔ ایک بات بتاؤں ڈیڈی ۔ میری تیز رفتار مسز کول کو بھی بہت پسند ہے۔ (Anyway) لٹ اس بی ۔ فری ۔ فرینک اینڈ فیرلیس (Let us Be free & frank Fearless) سگریٹ ! ۔۔۔ یہ دھواں دھند پیدا نہیں کرتا بلکہ دو دوستوں کو ایک کوڈ (Code) کی طرح ایک دوسرے سے جان پہچان کروا لیتا ہے ۔۔۔ اور پھر شراب ! وہ اپنائیت کا یقین دِلاتی ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ یہ شباب ۔۔۔ واہ ۔۔۔ واہ ۔۔۔ ڈیڈی تعلقات کا بھروسہ دِلاتی ہے ۔۔۔ ویسے ڈیڈی ۔۔۔ آپ کی چوائس (Choice) بھی گریٹ ہے ۔۔۔ مسز کول واقعی بے نظیر ہے ۔ مارولس !"

کرشن لال ہکّا بکّا رہ گیا۔ گویا چلتے چلتے وہ کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا ۔۔۔ ریت کے ذرّوں کی طرح ۔۔۔ اُس کے کانوں میں گھوڑے کے چلنے کی چاپ ۔۔۔ موٹر کی آواز اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ کی ملی جلی آواز کے ساتھ جب ۔۔۔

سا ئیرن کی آواز سنائی دی تب وہ خوفزدہ ہو کر فرش سے اُٹھتے ہوئے
دیوار پہ اپنا سایہ دیکھتا رہا جو بجلی بند ہوتے ہی غائب ہو گیا۔
وجے کی ماں نے دروازہ بند کرنا چاہا مگر کرشن لال نے دروازہ کھُلا
رکھنے کی ہدایت دی اور وجے کو اکیلے چھوڑنے کا اشارہ کیا۔

کرشن لال ایک شکستہ خوردہ سپاہی کی طرح آہستہ آہستہ اپنے
کمرے میں یوں داخل ہوا جیسے کسی کہانی کی آخری سطریں لکھنے بیٹھا
ہو۔۔۔ اور پنڈت دوارکا ناتھ دیوار پہ آویزاں کلاک کی سوئیاں۔
یوں دیکھ رہا تھا جیسے زنجیروں سے باندھا ہوا ایک قیدی اپنے
سامنے رکھے ٹایم بم کو دیکھ کر تباہی کے قدموں کی آہٹ سُن رہا ہو۔
اُسے قہقہوں اور سسکیوں کی ساتھ ساتھ گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز
بھی سنائی دے رہی تھی اس کے لب تھر تھرا رہے اور وہ اپنی آواز کو
روکنے کی یوں کوشش کر رہا تھا جیسے ایک ٹوٹا و کمزور باندھ سیلاب
کے پانی کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو!!
کلاک نے ۵ بجا دیئے۔ سحر ہو گئی اور یہ صبح وجے کی تھی!!
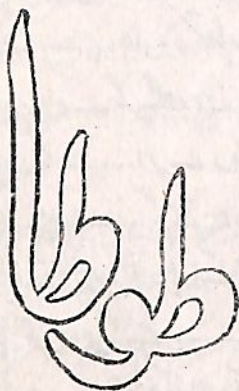
طوطا ——— ! ——— ہاں ہاں طوطا ——— طوطا نہیں کہوں گی
تو کیا کہوں ——— طوطو ——— یا طوطو رام ——— ہوں ——— میرا بس
چلتا تو تمہیں پنجرے میں بند کر دیتی اور کہتی طوطے ——— یہی تمہاری
تقدیر ہے ——— لیکن کیا کروں تم طوطا ہوکر بھی طوطے نہیں ہو ———
فقط طوطے کی طرح بولتے رہتے ہو ——— رٹ لگائے ———
ت ——— تہ ——— ٹ ——— ٹہ ——— پ ——— پ ——— پہ ———
بولنا ہی ہے تو بولو ——— منع کون کرتا ہے ——— بولتے جاؤ
چلاتے جاؤ ——— اس چھت کو کیا آسمان کو سر پہ اٹھاتے جاؤ
سرم (شرم) تو تمہیں ہے نہیں ——— ہوں ——— طوطا بولو
گنگا رام ——— ارے بھگوان کا نام کہتے تو اچھا تھا۔ تم تو بس

گالیاں بکتے رہتے ہو ــــ گندھی گندھی گالیاں ــــ چلو گالی تو گالی ہے گندھی کیا اور صاف کیا ـ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پڑوسی کیا کہیں گے ــــ چلو وہ تمھاری بک بک سننے کے عادی ہو چکے ہیں ـ مان لیتی ہوں ــــ مگر مجھے روز روز کیوں مارتے ہو ــــ اف ! ـ اف ! ـ ہائے ــــ ارے رؤ ؤں نہیں تو اور کیا کروں ــــ ہڈی پسلی توڑ دی ہے ــــ کم بخت نے ــــ اف ــــ سر بھی پھوٹ گیا ہے ـ کاغذی شیر ـ خود ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے مگر مجھے مارتا ہے تو ہاتھی بن جاتا ہے ــــ یہ تیلی تیلی ٹانگیں نہ جانے فولاد کیسے بن جاتی ہیں ــــ باہر جا کر خود تو مار کھا کر آتا ہے اور گھر آتے ہی مجھے مارتا ہے ــــ کیوں ــــ بڑا آیا مرد کا بچہ ــــ طوطے کو لوگ طوطا نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے ــــ راجہ رام گنگا رام ـ یہ سورام ـ ہوں ــــ میں بھی طوطو کہوں گی ـ ـ ـ ہاں ـ ـ ـ ہاں طوطو ! طوطو !! ـ کیوں چڑ جاتے ہو ــــ جب بھی دیکھو تو تمھارے ہونٹ ہلتے ہی رہتے ہیں ــــ کوئی کچھ کہے یا نہ کہے طوطو بولتا ہی رہتا ہے ایک ہی سانس میں ــــ ہا ـ ہا ـ ہا ـ ہو ـ ہو ــــ کم بخت ــــ یہ ہنسی بھی تکلیف دہ ثابت ہو رہی ہے ـ مگر ــــ مگر ــــ ہا ــــ ہا ــــ طوطا تو نیند میں بھی بولتا رہتا ہے ـ ہاں ــــ ہا ــــ ہا ــــ سچ ــــ ہاں صاحب ــــ مرغا ہے میٹھے ــــ گو بھی ہے ــــ مالک ہے ــــ سر

چھوٹا لاؤں یا بڑا ——— پانی لاؤں یا سوڈا ——— ہا ہا ——— ہاہا
گھر میں سوکھی روٹیاں نہیں ۔ بلکہ چاول نہیں ——— سڑی ہوئی
سبزیاں بھی نہیں ——— اور طوطا کہتا ہے ——— کیا کھائیں گے
صاحب ——— ہا ——— ہا ——— ہائے میری بیٹھ ——— بہت
درد کر رہی ہے ——— اف میں مر گئی ۔
ارے او طوطے ——— ! تمہیں مجھ پر ترس کیوں نہیں آرہا ہے۔
کم بخت لاتیں یوں مارتا ہے جیسے چھوٹے ماک فٹ بال کھیلتے ہیں۔
ارے واہ ——— اپنے بچاؤ کے لئے کیوں نہ ایک فٹ بال خریدی
جائے ——— جب وہ لات مارے گا میں اپنا بازو نہیں ———
فٹ بال آگے رکھ دوں گی ——— مگر فٹ بال ؟ ——— اف !
جاہل ——— گلا بھی یوں دباتا ہے جیسے سانپ ڈال دیا ہو
میں کبھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوں ——— مرتی بھی نہیں جانی
اور طوطا بھی مجھ پر ترس نہیں کھاتا ——— الٹا سا میری شاعری
کرتا ہے ——— ہائے دھنو ! ——— تمہارا دھندہ ایک ایسا
چھاتہ ہے جس میں شہد کی ایک بوند بھی نہیں ——— بس کانٹے
ہی کانٹے ہیں ——— جو مجھے چبھتے ہیں ——— کہاں چبھتے ہیں ———
مگر ——— مگر کیا معلوم چبھتے ہوں ——— کیسے پتہ چلے ! ——— میں
کوئی جوتشی تھوڑے ہی ہوں ——— کسی سے پوچھوں گی مگر کس
سے ——— وہ جوتشی پیسے کھاتا ہے ——— ہر بار کہتا ہے کہ دھنو

تم رانی ہو ـــ ہوں ـــ رانی ! ـــ چلو آج طوطے
سے پوچھ لوں ـــ مگر نہیں ـــ نہیں ـــ ہرگز نہیں ـــ
آج میں نے طوطے سے کوئی بات نہیں کرنی ہے ـــ کیوں کروں ایک
کیسے کروں ـــ رشتہ ختم ـــ ناطہ ٹوٹ گیا ـــ جو ہاتھ پکڑ لیا
تھا وہی تو توڑ دیا کم بخت نے ـــ ہائے ماں ـــ کل تو طوطا
یم راج بن گیا تھا ـــ لیکن آج جب آئے گا مزہ چکھاؤں گی۔
دروازہ بھی نہیں کھولوں گی ـــ بولوں گی بھی نہیں ـــ کھلے
گا خود ہی وہ دال کا کٹورا ـــ بے شک چلاتا رہے ـــ چیختا
رہے ـــ ڈر کس بات کا ـــ پڑوسی تو جان ہی گئے ہیں
کہ طوطا مجھے ہر رات مارتا ہے ۔ بے چارے تنگ پڑ گئے ہیں ۔
میں بھی کیا کروں ۔ چیخوں نہیں ۔ چلاؤں نہیں ۔ تو کیا کروں ۔ لطیفے
سناؤں ۔ پریوں کی کہانیاں سناؤں ۔ فلمی گانے گاؤں ۔ ٹھیک ہے
نہ طوطا مجھے مارے اور نہ میں چلاؤں ۔ ہوں ۔ آج تو خاموشی ہوگی ۔
دراصل میں بھی جاہل ہوں ـــ میری ماں بھی جاہل تھی ۔ وہ بھی میرے
باپ کو گالیاں دیتی تھی ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ میں جاہل تھی ۔ اب میں بڑی
ہو گئی ہوں ۔ نانی ۔ ہی ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ چلو نانی نہ سہی ۔ ماں تو بننے والی ہوں نا
میں بڑی سمجھدار ہوں ـــ آج مزہ آئے گا ـــ طوطا آئے گا
تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی ـــ مجھے کیا پڑا رہے یوں ہی
باہر برامدے پہ ـــ روز کہتا ہے گھر چھوڑ کے جاؤں گا
چلا جائے ـــ میرا کیا میرے ساتھ میرا بیٹا ہوگا ـــ بیٹا !

چلو بیٹی سہی ـــــ طوطا چلاتا رہے گا اور میں چپ چاپ کمبل اوڑھ کر
سو جاؤں گی ـــــ ارے کمبل میں ایک اور چھید ہو گیا ہے ـــــ
کہا تھا طوطے کو ـــــ ہوں ـــــ چلو ٹھیک ہے ـــــ میرے
لئے تو کافی ہے ـــــ جوں توں ڈھانپ لوں گی اپنے جسم کو ـــــ
طوطے نے آج کچھ کہا تو کاٹ کھا جاؤں گی اسے ! ـــــ یہ میرے
لمبے لمبے ناخن بھی تو آج کمال دکھائیں گے ـــــ ہا ـــــ ہا ـــــ آج
تو میں کہہ دوں گی ـــــ تم جُلم (ظلم) کرتے ہو ـــــ تم بُرے آدمی
ہو ـــــ بُرے نہیں ـــــ بہت بُرے آدمی ـــــ تم آدمی ہو ہی
نہیں ـــــ طوطے ہو ! میرا تیرا کوئی رشتہ نہیں ـــــ یہ بھی کہوں
گی کہ باپ بننے والے ہو مگر میں اپنے ہونے والے بچے کو ہاتھ
تک بھی نہیں لگانے دوں ـــــ روئے گا بے چارہ ـــــ میرے
پاؤں پکڑے گا ـــــ لیکن میں اپنا دل پتھر بنا لوں گی ـــــ جلئے
گا کہیں کسی سراتے میں ـــــ طوطا ! ـــــ میں کل سویرے کام پر
بھی جاؤں گی ـــــ دیکھتی ہوں کون روک لے گا مجھے ـــــ !
میں آندھی ہوں ـــــ طوفان ہوں ـــــ سیلاب ہوں ـــــ ہا

ہا ہا ہا ہا ہ اُف

اُف مار کھانے سے آدمی کیا اتنا مجبور (کمزور) ہو جاتا ہے

ہائے ہائے میرے سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا

بانس کی طرح سوکھا یہ آدمی میرے لئے پہلوان کیسے بن جاتا ہے۔

لیکن قصہ ختم کہانی ختم طوطے جو تو نے ہاتھ اٹھایا۔
دیکھ لینا میں کیا کرتی ہوں۔ ہوں مونچھوں پر یوں تاؤ دیتا ہے جیسے کوئی
سیٹھ کا بچہ ہے۔ ارے طوطے چوہے کی بھی تو مونچھیں ہوتی ہے۔
اور میں بلی ہوں۔ آج تمھیں کھا جاوٴں گی۔ دبوچ لوں گی۔ دیا کھرلف
کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ صاحب کہتا ہے ویٹر۔ طوطا دوڑ کر ہانپتے ہوئے
کہتا ہے۔ یس سر۔ سیلوٹ بھی کرتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ شرابیوں کی الٹی بھی
صاف کرتا ہے۔ ہوٹل کے برتن بھی صاف کرتا ہے اور مجھے کہتا ہے۔ دھنوا۔
تم جھوٹی ہو۔ تمھارے ہاتھوں سے بدبو آتی ہے۔ جھوٹی ہوں!۔
ہوں۔ کون کہتا ہے میں جھوٹی ہوں۔ ارے طوطے تمہیں عقل ہوتی
تو خود سوچ لیتے کہ اگر میں لوگوں کے برتن صاف نہیں کروں گی تو کون
کرے گا بھلا۔ بڑی مالکن کا وجن (وزن) زیادہ ہو گیا ہے۔ بیچاری
اٹھ بھی نہیں سکتی۔ چھوٹی مالکن تو بیچاری امید سے ہے۔ پاؤں
پھسل گیا تو ٹیڑھا سیدھا بچہ پیدا ہوگا۔ بچہ مر بھی جاتا ہے تمہیں
تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے نا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ کیا ہوا جو ابھی
میرا بچہ نہیں ہوا۔ ہوا ہوتا۔ تو نے ہی تو حمل گرایا تھا۔ تم فٹ
بال جو کھیلتے ہو۔ سنو تم اپنی ٹانگوں کو باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔
لیکن پھر تم چل پھر نہیں سکتے۔ طوطے!۔ دیکھو تم بات سمجھ نہیں
سکتے۔ کیسے سمجھ سکو گے۔ تم جاہل ہو۔ طوطے ہو طوطوا طوطوا!
چھوٹی مالکن کا اگر لڑکا ہوا تو بتاؤ۔ اُس ننھے منے کو کون پالے گا۔

بُری ہوں ـ گنوار ہوں ـ غصے سے بات کرتی ہوں ـ ناک چڑھا کر
بات کرتی ہوں ـ پیار سے اگر بات کروں ـ طوطا جو بھی کہتا ہے ـ
سچ ہی تو ہے ـ طوطا کہا ـ لیکن پیار سے کہا ـ غصے سے
نہیں سچ بھگوان کی قسم ـ طوطے کی قسم ـ ہائے
ماں ـ طوطے کی آنکھیں کتنی اچھی ہیں ـ طوطا کتنا سمجھدار ہے ـ
ٹھیک ہی تو کہتا ہے ـ میں جوان ہوں ـ گوری ہوں خوبصورت
ہوں ـ اور صبح سویرے اکیلی سیٹھ کے گھر جاتی ہوں ـ ٹھیک ہی تو
کہتا ہے وہ ـ سیٹھ کے دونوں لڑکے مجھے گھور گھور کر دیکھتے ہیں ـ
ایک دن تو کمرے میں بھی گھسیٹ کے لے گئے تھے ـ چلو بابا
نادو ساڑھی پر گھسیٹتے کیوں ہو ـ اس روز تو فوٹو بھی کھینچا
تھا میرا ـ مگر ہوں تب کیا ہوا ـ میرے دل میں کوئی میل
تھوڑی ہی تھی ـ طوطا یوں ہی شک کرتا ہے ـ مگر ـ مگر ـ
ہائے رام وہ میرا آنچل ـ ہائے رام وہ فوٹو طوطا دیکھ
لے گا ـ میں بڑی بے سرم (شرم) ہوں ـ طوطا ٹھیک کہتا
ہے ـ وہ دونوں مجھے یوں دیکھتے رہتے ہیں جیسے میں نے پلیٹ
میں گرم گرم کباب ہوں ـ کباب! ـ ارے ہاں ـ اس
روز سیٹھ نے جو چیز کھلائی تھی کباب ہی تو تھا ـ مگر جب میں
میں کباب کھا رہی تھی وہ میرے سینے کو کیوں دیکھ رہا تھا ـ
بوڑھا ہے ... بُری نظر سے تھوڑے ہی دیکھتا ہے ـ

لیکن بملا کہتی ہے کہ وہ ــــ بکتی ہے ــــ مجھے ڈراتی رہتی ہے۔ بڑی مطلبی عورت ہے ــــ چلو بابا مان لیتی ہوں کہ وہ مجھے بڑی نظر سے دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن میں کیا کر سکوں گی۔ "متکلا" تو یہ گھر بملا سے چھوٹ گیا ہے۔ ورنہ مجھے کون کام دے گا ــــ ہوں۔ اگر میں طوطے کو بتاؤں کہ سیٹھ کے چھوٹے لڑکے نے کل مجھے دلوچ لیا تو وہ بجلی بن کر اس پر برس پڑے گا۔ نانی یاد آئے گی کُتے کی۔ اپنی ماں بہن نہیں ہے کیا۔ کمینہ۔ مگر۔ طوطے تو اُس گھر کے بچوں سے بھی ڈرتا ہے۔ اںہیں۔ جناب کہتا ہے۔ یہ جناب کیا ہوتا ہے ؟۔ اگر میں بھی طوطے کو جناب کہوں تو شاید مجھے روز روز مارنا چھوڑ دے۔ نہیں میں آج طوطے سے کہہ دوں گی۔ کہ بڑا پہلوان بنتا ہے۔ جا سیٹھ کے بیٹے سے توڑ کے آ ــــ مگر نہیں۔ وہ لوگ طوطے کی گردن مروڑ دیں گے اور طوطا خاموش ــــ نہیں ــــ نہیں۔ وہ میں طوطے کو نہیں بتاؤں گی۔ مگر میں طوطے کو کچھ نہیں بتاتی۔ اسے سب کچھ کیسے معلوم ہوتا ہے۔ ہاں۔ ٹھیک ہے ــــ طوطا جادوگر ہے۔ اس وقت ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے اُسے آنکھیں بند کرتے ہی سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔ پھر میں اگر گھر چھوڑ کے جاؤں تو ــــ چلو نہیں جاتی ــــ مگر آج تو میں فیصلہ کر لوں گی ــــ ظالم (ظالم) مرد اکام کرنا چھوڑ دے۔ کھائیں گے کیا ؟۔ ابھی لوٹیاں ہوں۔ کمرے کا کرایہ ــــ آٹا۔ چاول۔ دال ــــ کہتا ہے ایک

ہی کھائیں گے — ٹھیک ہے طوطا رام جی — مگر جب منّا آئے گا پھر — کیسے پالیں گے اُسے۔ منّا۔ منّا بڑا ہوگا تو میری طرف داری کرے گا۔ ہاں۔ ہاں میری۔ یوں بڑی بڑی مونچھیں رکھے گا۔ رنگ دار قمیض پہنے گا — سفید وردی نہیں — وہ تو بیرے پہن لیتے ہیں۔ اُف پھر یاد آگیا یہ طوطا رام — ! ہوں۔ دیکھو تو یہ طوطا کیسے اکڑ جاتا جیسے موٹر میں بیٹھ کر آیا ہے۔

ارے آدھی رات تو ہوگئی۔ طوطا نہیں آیا۔ جان گیا ہوگا کم بخت کہ آج مقابلہ ہے۔ اِس سے پہلے کہ وہ مجھے مارے آج میں ہی اس کے بال نوچ لوں گی — لو — لو — آگیا — طوطا!! میں اُسے طوطو ہی کہوں گی — دروازہ نہیں کھلے گا آج — جالم (ظالم) کو باہر ہی پڑا رہنے دو — اچھا ہے۔ گالیاں ہی دے گا نا — دیتا رہے۔ کم از کم مارے گا تو نہیں — میں پاگل ہوتا۔ اُس کے جسم کے ساتھ چمٹ جاتی ہوں — آج سامنے نہیں آنے دوں گی۔ مگر باہر سردی ہے۔ ٹھٹھر جائے گی — یہ راکھشش مر کیوں نہیں جاتا — ! ہائے — ہائے — میری زبان کٹ جاتی — میں ڈاین ہوں۔ اپنے مرد کو کوئی ایسی گالی دیتا ہے کیا — لیکن شوہر کبھی بیوی کو مارتا نہیں ہے۔ چھوٹی مالکن سگریٹ پیتی ہے — شراب پیتی ہے۔ لیکن پھر بھی مالک اسے کچھ بھی تو نہیں کہتے ... کیا ... ہے ... ہی لگا کام کر ...

——— چلو نہیں کرتی۔ رانی بن کر دن بھر یہاں بیٹھی رہوں گی۔ سن رہے ہو۔ طوطے! ۔ سن رہے ہو طوطا۔ طوطے ——— طوطا رام ——— طوطا رام جی ——— طوطا رام شرما ——— پنڈت طوطا رام جی شرما صاحب ——— جناب! ——— ارے کیا ہوا ——— اندر آؤ ——— اندر آؤ ——— دروازہ کھلا ہے ——— ارے کیا ہوا ——— ہائے میں مر گئی ——— خون ——— ! ——— خون ۔ !! کیوں کسی نے آج پھر بیری بات سنائی ——— پھر کسی نے مارا ——— جھگڑا ہوا ——— کس سے؟

ہا ——— ہا ——— ہا۔

ارے مسکرانا گناہ ہے کیا ——— ہا ——— ہا ——— ہا ——— چل اندر آ۔ آج تم بلی کی طرح مجھے دیکھ رہے ہو ——— کچھ بولتے نہیں۔ آج میں تمہیں گالی نہیں دوں گی ——— لیکن طوطے ——— تمہارے جسم میں اتنا خون کہاں سے آیا ——— لال ——— لال ——— خون ——— اف کس نے مارا تمہیں ——— بول ——— بول ——— میں اس کا خون پی جاؤں گی ——— بولتا کیوں نہیں ——— ! ——— غنڈوں نے ——— کسی صاحب نے؟ صاحب !! ——— شراب پی لی ہو گی نا ۔ پھر ۔ یہ شراب تم ہی تو پلاتے ہو۔ ان صاحب لوگوں کو الٹی صاف نہیں کی تھی نا ۔ کلیجہ پھٹ رہا ہے نا ۔ بے اٹھا اپنے ہاتھ پاؤں اور مجھے جتنا چاہے مار ——— مار ——— مار کر مجھے گھر سے نکال ——— کیا مالک نے نوکری سے الگ کیا ——— ہائے ——— اب کیا ہو گا .... اب کیا ہو گا ——— ارے

او طوطے تو نے یہ کیا کیا۔
اب گھور گھور کے مجھے کیا دیکھ رہا ہے ..... سوچا ـــــ
ہر طوطا ایک نہ ایک دن بولتے بولتے خاموش ہو جاتا ہے اور
پنجرے میں دوسرا طوطا آتا ہے ۔ مالک کو ایک اور طوطا مل چکا ہوگا۔
مالکن کو نوکرانی مل چکی ہوگی ــــ اب سوچنے سے کیا فائدہ ـــــ
سوچ جا ـــ طوطے سوچا ـــ جاگتے رہوگے تو اپنا خون پی جاؤگے۔
دیکھ طوطے تم رومت ـــ تم رومت ـــ میں کل صبح سیٹھ کے
پاؤں پکڑ لوں گی ــــ اس کے دونوں لڑکوں کے پاؤں پکڑ لوں
گی۔ مگر تم رومت ـــ تم رومت ـــ طوطے ـــ !۔ پیار سے
طوطا کہا ـــ غصے سے نہیں ـــ طوطے ـــ ! جانتے ہو ـــ اسی
مہینے میں شاید ہمارا منّا آئے گا ـــ منّا ـــ پیارا منا ـــ میرا
منا ـــ تمہارا منّا ـــ اف ـــ نا آتے تو اچھا ـــ طوطے
اُٹھ زور سے ایک رات مار ـــ میں کہتی ہوں ـــ لات
مارتا ـــ دیکھو آج کی رات اتنی تاریک ہے تو کل کی
کی رات اس سے بھی بھیانک ہوگی ـــ طوطے ـــــ
تم کچھ بولتے کیوں نہیں ـــ !
طوطے رام ـــ طوطا رام ـــ ہے رام ! ـــ ہے
رام !! اتنا تو بتا دے کل کام پر جاؤں یا نہیں۔ ! ـــ !!

میں نے ایک خواب دیکھا — نہیں — نہیں — وہ خواب نہیں
جو میں دن کو خواب دیکھتا ہوں۔ ہاں — ہاں۔ وہ تو پاگل پن ہے۔
نہیں۔ نہیں۔ میں پاگل تو نہیں ہوں۔ کیسے؟۔ پاگل کو نیند آتی ہے۔
وہ چیختا ہے چلاتا ہے۔ پتھر اٹھاتا ہے — کبھی کبھی پیچھے کیا گئے
والے کو جان سے بھی مار ڈالتا ہے۔ کتا کاٹ لے تو کتے سے
انتقام لیتا ہے۔ بھگوان سے بھی جاہلوں کی طرح لڑتا ہے۔ میں
کسی سے لڑتا نہیں ہوں۔ انتقام! کس سے؟ ہوں!۔ اس
روز جب کالو دادا نے مجھے مارا تب میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس
برداشت کرتا رہا۔!۔ تم میں برداشت کا مادہ نہیں اس لیے
چلا رہی ہو — میری باتیں بھی سننے کے لیے نہیں — چلو باتیں

نہ سہی ۔ یہ تو سن لو کہ میں نے خواب میں کیا دیکھا ۔ خواب !۔۔ ہاں
کہہ تو رہا ہوں ۔۔ ہاں ۔ ہاں ۔ میں نے ایک خواب دیکھا ۔ نیند
میں کہہ تو رہا ہوں ۔ کیوں مجھے سونا نہیں چاہئے تھا ۔ کیوں ۔ ؟
مگر ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو ۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے ۔
جاگتے رہو ۔ جاگتے رہو ۔ کہنے والا میرا اپنا تھا ۔ وہ جب خود ہی
ابدی نیند سو گیا تو مجھے جگائے گا کون ۔ تم ۔ ؟ ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔ تم
خود ہی سوئی پڑی رہتی ہو ۔ ٹھیک ہے ہم دونوں جاگتے رہیں گے
مگر کب تک ۔ ؟ ۔ ٹھیک ہے ۔ پھر سنو ۔ ہاں میں نے ایک
خواب دیکھا ۔۔ جانے کونسا شہر تھا ۔۔ نہیں ۔ نہیں ۔ شہر میں اونچی
عمارتیں ہوتی ہیں ۔ وہ ایک گاؤں تھا ۔۔ بہت خوبصورت گاؤں
واہ ۔ ! ۔ واہ !! ۔۔ وہی گاؤں جس کے بارے میں میری ماں اکثر
کہا کرتی تھی ۔۔ وہی ! ۔ وہی !! ۔۔ مگر یہ گاؤں تو میں نے خواب
میں دیکھا ۔ اماں نے کہاں دیکھا تھا ! ۔۔ جھوٹی ! ۔۔ نہیں ۔ نہیں ۔
وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی ۔۔ گھر میں جب کھانا نہیں ہوتا تھا تو
بتاتی تھی ۔ سچ سچ ۔ سچ بولنے والا بھگوان کا لاڈلا ہوتا ہے ۔
میں بھی اماں کا لاڈلا تھا ۔۔ اماں جھوٹی نہیں ہے ۔ اس نے ضرور
اس گاؤں کو کہیں دیکھا ہوگا ۔ اس نے اس پری کو بھی دیکھا
تھا جو بچوں کو ۔ بچوں کو ہی کیوں مجھے بھی تو ۔ نیند میں پیٹ
بھر کر کھانا کھلاتی تھی ۔ دراصل میں ہی [illegible] ہوں جو کبھی میرا پیٹ

ہی نہیں کھیرتا۔ دیکھو تو میرے پیٹ میں کوئی چھید تو نہیں ہے ۔۔ ؟
نہیں ۔۔۔ چلو اچھا ہے ۔۔ ورنہ ۔۔ ا ۔۔ ارے میں کھول ہی گیا۔
ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں ۔۔ وہ گاؤں ۔۔ وہی گاؤں ۔ چلو تم
کہتی ہو تو میرا گاؤں خوبصورت گاؤں! ۔ خواب میں ۔ اور کیا ۔۔ واہ!
واہ !! سرسبز مخملی گھاس پر شبنم کے قطرے پکھراج کی مانند چمک کر تم
سے ۔ ہاں ہاں مجھ سے بھی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ۔ مرمری شانوں
پر سنہری گیسو بکھیرے تم پکھاوج کی تھاپ پر یوں ناچ رہی تھی۔
میں بھی تو ناچ رہا تھا۔ گا بھی رہا تھا۔ وہی گانا جو ایا گاتے تھے ۔۔
آسمان پر تیرتے ہوئے بادل کے ٹکڑوں کو دیکھ کر تپتی ہوئی زمین پر
اچھل اچھل کر یوں بابا گرمی سے بالکل نہیں ڈرتے تھے ۔ بہادر
تھے اور کہتے تھے بیٹے گرمی سے کیا ڈرنا۔ گرمی اچھی ہے ۔ چلو تر پاتی
ہے مگر کمزور نہیں ہوتے دیتی ۔ اور یہ سردی ! ۔ اُف انسان کو کمزور
ہی نہیں ڈرپوک بنا دیتی ہے ۔ یوں شکڑ شکڑ کر سبھی چلتے ہیں ۔
مجھے بھی گرمی ستا رہی تھی ۔ مگر پھر بارش برسی ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ سیلاب
نہیں آیا ۔ ڈر گئی ۔ پھر سنو ۔ میری بات تو سنو ۔ تم مالن تھی ۔ اور
میں مالی ۔ خواب میں ۔ نہیں تو کیا سچ مچ ۔ ارے پگلی زمین تو کب کی
بہہ چکی ہے ۔ وہاں تو اب پتھر ہیں ۔ موٹے موٹے ۔ مگر جانتے وہ پتھر
کو ات اکھا گیا تھا ہماری زمین ایک گلزار کی مانند مہک رہی تھی ۔ واہ۔
وہ بڑے بڑے گندم کے خوشے ! ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ چاول کے خوشے !!

نہیں۔ نہیں۔ دونوں بہک رہے تھے۔ واہ۔ اور وہ اونچے اونچے پہاڑ۔ برف سے ڈھکے پہاڑ۔ وہ آبشاریں۔ رم جھم کرتی ہوئی دلکش۔ واہ۔ کہاں۔ خواب میں اور کہاں۔ ہماری پہاڑی پر جنگل تو ہے ہی نہیں۔ ابّا کہتے تھے اگر جنگل ہوتے تو سیلاب کبھی نہیں آتے یعنی جنگل۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیوں تمہیں میرا ہنسنا اچھا نہیں لگتا۔ ابّا کو بھی کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہوں۔ اماں تو رونے بھی نہیں دیتی تھی۔ تم بھی مجھے ویسے ہی ٹوکتی ہو۔ ہاں۔ ہاں۔ روکتی بھی ہو۔ تم کیسی عورت ہو۔ بالکل میری ماں جیسی۔ ہوں۔ پھر۔ پھر۔ کہوں۔ ہاں پھر جانتی ہو کیا ہوا۔ تم اور میں۔ چہچہاتے پرندوں۔ سر بفلک درختوں۔ ننھے ننھے پودوں۔ ادھ کھلے غنچوں۔ گلستان کی بہاروں۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے رہے۔ تمہاری پایل بجتے رہے اور میری آواز گونجتی رہی۔ میری آواز دور دور تک جا رہی تھی۔ ہاں جیسے میں کوہ طور پر جا کر خدا سے باتیں کرنے لگا تھا۔ پائیل؟۔ تمہیں نہیں معلوم؟ ٹھیک ہی تو ہے نوکیلے پتھروں پر چلنے والا بھلا پائیل پہنے بھی تو کیسے۔ میری ماں نے بھی کبھی پائیل نہیں پہنے تھے۔ پھر وہ کیا تھا! — ہاں یاد آیا۔ وہ زنجیر تھی۔ زنجیر۔ موٹی۔ موٹی۔ زنجیر۔ ماں نے تب ڈالی تھی۔ جب ابّا مر گئے تھے۔ آہ۔ ہو۔ بتایا نا ملبے کے نیچے دب گئے تھے۔ مجھے پیاس لگی

پھر۔ مگر۔ ہا۔ ہا۔ وہ زنجیر بہت کام آئی۔ ہاں ماں دروازے کے ساتھ ہی بندھی ہوئی رہی۔ گاؤں ڈوب گیا تو لاش کسی کو ملی نہیں۔ کھا گئیں مچھلیاں۔ موٹی موٹی مچھلیاں۔ مگر اماں کی لاش مل گئی۔ اماں مر تو نہیں گئی تھی۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی مجھے جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو۔ بھاگ جاؤ۔ دوڑ لگاؤ۔ اور تیز۔ اور تیز۔ پانی آرہا ہے۔ پانی آیا اور اماں مر گئی۔ جب میں نہیں رو رہا ہوں پھر تم کیوں رو رہی ہو۔ مگر ہاں یاد آیا۔ اماں کہتی تھی ایک پری جب روتی تھی تو اس کے آنسو کا ہر قطرہ ایک موتی بن جاتا تھا۔ ہاں۔ پری کے گھر میں موتیوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ کھانا تو ہوگا ہی۔ کپڑے۔ مکان سبھی تھے پری کے پاس۔ تبھی یہ پریاں اڑتی ہیں۔ بہت امیر ہوتی ہیں۔

ایک دن کیا ہوا۔ میں نے جب ماں کو بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھا تو میں بہت خوش ہوا۔ ہیروں کے ڈھیر لگ جائیں گے کیوں اماں پری نہیں ہو سکتی۔ وہ بھی اڑ سکتی تھی۔ ا۔ گھر میں کھانا ہوگا۔ دو دن کے لئے۔ نہیں نہیں دو ہفتے کے لئے۔ کیوں! دو مہینے کے لئے کیوں نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ دو سال کے لئے۔ دو سال کیوں عمر بھر کے لئے۔ کپڑے بھی ہوں گے۔ ایک بہت بڑا مکان ہوگا۔ وہ بڑے بڑے کمرے۔ ہا۔ ہا۔ پھر بارش کا کیا ڈر۔ کچّی چھت تھوڑے ہی گر جاتی ہے۔ میرا ایک بھائی ڈوب کر مر گیا تھا تا۔ ہاں۔

نہیں۔ نہیں۔ مجھے یاد نہیں آرہی ہے۔ اور پھر۔ ہاں۔ یاد آیا۔ میں نے سوچا یہ سورج جو ہر سال گرمیوں میں میری آنکھوں میں لالی ڈال کر۔ نہیں۔ نہیں۔ مرچی نہیں۔ گرمی۔ لالی ڈال کر مجھے اندھا بنا دیتا ہے۔ پھر کہاں ڈھونڈے گا مجھے۔ میں گرمیوں میں نچلی منزل میں چھپ جاؤں گا اور سیلاب کے وقت اوپر۔ اوپر نہیں۔ اُوپر۔ او وو پر چھت پر بیٹھا رہا ہوگا۔ ہا۔ ہا۔ لیکن وہ مکان بنا ہی نہیں۔ ماں ابّا کی موت کے بعد کئی دن لگاتار روتی نہیں۔ مگر ایک بھی قطرہ موتی نہیں بن گیا۔ پھر۔ پھر۔ اماں کے آنسو سوکھ گئے۔ خشک سال نہیں معلوم۔ ویسے ہی۔ اماں کی آنکھوں سے آگ برسنے لگی۔ تم خود ہی سوچ لو۔ کیا رونے سے کچھ فایدہ ہوا۔ نہیں۔ نہیں۔ پھر رونے سے کیا فایدہ کیوں تکلیف ہو رہی۔ میرا بھی کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ مگر۔ ہا۔ ہاہا۔ ہا۔ میرا کلیجہ تو ہے ہی نہیں۔ وہ کوئی پری نکال کے لے گئی ہے۔ پری نہیں۔ کسی دیو نے نکالا ہوگا۔ وہی۔ وہی۔ ہاں۔ وہی دیو۔ جانتی ہو۔ پھر کیا ہوا۔ خواب میں اور کہاں۔ وہی خواب جو میں نے کل دیکھا۔ ایک بہت لمبا دیو نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا کالا رنگ۔ جیسے کالے بادل۔ چلو تم کہتی ہو تو کالی رات سہی۔ بڑی بڑی مونچھیں جیسے کالو دادا کی مونچھیں۔ نوکیلے دانت۔ لال۔ لال آنکھیں۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا پہنے ہوئے۔ پھر۔ پھر۔ وہ منہ کھول کر۔

آگ برسانے لگا۔ تب تو موم کی طرح پگھل گئی۔ میں تمہیں صدائیں دیتا رہا۔ مگر تم میری آواز سنتی بھی تو کیسے۔ کان تھے ہی نہیں۔ پھر کالے دیو نے پانی برسانا شروع کیا۔ اِدھر پانی۔ اُدھر پانی۔ میں چیخ پڑا۔ تم کیسے دیکھ سکتی۔ تمہاری تو آنکھیں تھی ہی نہیں۔ میں پھر چیخ پڑا۔ اور۔ اور جاگ پڑا اچھا ہوا خواب ٹوٹ گیا۔ ہاں۔ بُرا تھا نا مگر تم کیوں ڈر گئی ہو۔ خواب ہے۔ اس میں سچ کیا اور جھوٹ کیا۔ تم ہی تو کہہ رہی تھی۔ نہیں۔ نہیں۔ خواب خواب ہے کسی دبی خواہش کا عکس نہیں۔ اور۔ اور۔ اگر ہو بھی۔ اگر ہو بھی۔ ہماری۔ خواہشات تو پیدا ہوتے ہی ہم سے الگ کر کے کوڑا کرکٹ کے ساتھ دفن کی جاتی ہیں۔ لیبل لگ جاتا ہے نا۔ تبھی تو لوگ مجھے کرشن لال کی بجائے "کوکا" کہتے ہیں۔ یہ کوکا کیا ہوتا ہے۔ ہوں۔ بے مطلب! ہمارا وجود بھی تو بے مطلب ہے۔ چلو اچھا ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ نام تو دیا ہے۔ ورنہ بھیڑ بکریوں۔ گھوڑوں۔ گدھوں کی پیٹھ پر نمبر لکھے جاتے ہیں۔ دیکھوں تو۔ شاید تمھاری پیٹھ پر بھی کوئی نمبر لکھا ہو!۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ تمھاری تو پیٹھ ہے ہی نہیں۔ ہا۔ ہا۔ اور اگر ہوتی بھی تو جانتی ہو کیا ہوتا۔ تم کو بھی کھاری وزن اٹھانا پڑتا۔ پھر روتی کیوں۔ تمہیں کچھ سہ مل جاتا۔ مگر مگر۔ مل تو جاتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ تم سے تو کم بخت اپنا بوجھ بھی تو

اٹھایا نہیں جاتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ مجھے تمہارے ان قہقہوں میں رونے
کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ کیوں تم کوئی دانشور ہو۔ کوئی
دانشمند ہو۔ تم بے وقوف ہو۔ نہیں نہیں تم بے وقوف نہیں۔
پھر تمہارا نام۔ ہاں۔ تم گدھے ہو۔ تم بزدل ہو۔ ڈرپوک ہو۔ گونگی
ہو۔ بہری ہو۔ اندھی ہو۔ مگر تم ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ
ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں نے ماں کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ماں نے
اپنی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔ بہت کمزور تھی نا۔ تم میں بھی کچھ
دم نہیں۔ کاغذ کی شیرنی۔ چلو شیرنی تو ہو۔ ا۔ لو۔ لو۔ آدھی رات تو
کٹ گئی۔ کم بخت یہ کتے۔ اف رات بھر بھونکتے رہتے ہیں۔۔۔
بھوک لگی ہے تو دن کے اجالے میں شور کرو بھئی۔ ہاں۔ ہاں
بھائی کہا۔ کیوں۔ وہ یوں کہ۔ دیکھو۔ جب دو جاندار۔ نہیں
نہیں۔ جانوروں کی چند کمزوریاں۔ ہاں۔ ہاں۔ کمزوریاں۔
مشترکہ ہوں تب وہ ایک فیملی بن جاتی ہے۔ جیسے چوپائے
گائے بھینس۔ سوچو تو ذرا۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ کتا بھی
بھوکا ہے۔ میں بھی سردی سے ٹھٹھرتا ہوں اور کتا بھی سردی
سے ٹھٹھر جاتا ہے۔ کتا بھی ڈنڈے سے ڈرتا ہے اور میں بھی
کالو دادا سے ڈرتا ہوں۔ پھر۔ پھر۔ بتاؤ تم ہی۔ چلو تم ناراض
ہو رہی ہو تو کتے کو بھائی نہیں کہوں گا۔ پھر بھائی کون ہے۔
کالو دادا ہے۔ اف تم بہت جلدی رنجیدہ ہو جاتی ہو۔ پھر بھی تم

نہیں اب۔ کچھ تو بولو۔ میں کب سے بک بک کئے جا رہا ہوں۔
اور تم بس گھور گھور کر یوں دیکھ رہی ہو جیسے تم میری ماں ہو۔
وہی پچکے گال۔ زرد چہرہ۔ سوکھے ہونٹ۔ اُجڑے بال ——
جیسے ہرے ہرے لہلہاتے کھیتوں کے اوپر۔ ہاں۔ ہاں
ہماری کھیتوں کے اوپر۔ سیلاب کا پانی بہہ کر نکل گیا ہو۔ سچ سچ
بتاؤ۔ تم میری ماں ہی تو نہیں ہو —— ہا۔ ہا۔ ہا۔ سمجھ گیا۔ تم ماں بننے
والی ہو۔ یہ ماں کیا ہوتی ہے۔ ایک عورت۔ نہیں۔ نہیں۔
بچہ پیدا کرنے والی مشین۔ اگر بچے پیدا ہی نہ ہوں۔ ہا۔ ہا۔
ہا۔ تب میں بھی پیدا ہی نہیں ہوا ہوتا۔ پھر کہاں ہوتا میں۔ مگر
تم تو سچ مچ ماں بننے والی ہو۔ ڈاکٹر۔ نرس۔ دوائی۔ کہاں سے
لاؤں ان کو۔ کھڑکی کھلی رہنے دو۔ بچہ خود بخود چلا آئے گا ——
ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر۔ واہ! ۔ دیکھو تم سچ سچ بتا دے۔
کیا تم واقعی ماں بننے والی ہو۔ لیکن کب!! ۔ کب!! کب!!
اُدھر کیا دیکھ رہی ہو۔ کھڑکی بند کر دوں۔ ہاں۔ اب سمجھا ——
وہ آ رہا ہے۔ ہے نا۔ ہاتھ میں مشعل لئے۔ مگر یہ تو چھوٹا بچہ
ہے۔ ارے یہ تو وہی بچہ ہے جسے میں اکثر خواب میں دیکھتا ہوں
کل والا خواب نہیں۔ وہ بھیانک تھا۔ وہ خواب جو میں دن کو
دیکھتا ہوں۔ آنکھیں کھول کر۔ ہاں وہی روشنی کی کرن۔
مگر۔ اگر مرغا بانگ نہ دے تو کیا سحر پھر بھی ہو گی۔ اگر طلوع

آفتاب کے قدموں کی آہٹ سنائی نہیں دے گی تو کیا اُمید کی سرگوشیاں
سنائی دیں گی — یہ اندھیرا کیسے مٹ گیا۔ اچانک ۔ واہ —
واہ! نئی سحر۔ نئی صبح ۔ نیا دن ۔ نیا سال۔ نئی صدی — وہی
امید کی کرن آرزوں کا عکس ۔ خوابوں کی تعبیر۔ ایک باپ ایک ماں
ایک بیٹا۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے کھیت ۔ ساغی کسان ۔ اور
مستقبل کا خوشحال انسان — مگر یہ جانا پہچانا بچہ ہے کون ۔ آج
تو اپنی شکل دِکھاؤ۔ ارے! ارے!! ۔ ارے واہ ۔ ابّا تم۔
تم ۔ مگر۔ ہا۔ ہا۔ ہا ۔ تم اِتنے چھوٹے کیسے بن گئے ۔ ا ملبے سے
نکل آئے ؟ اماں کو ساتھ نہیں لایا۔ نہیں ابّا تم چلے گئے تو اماں
بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ۔ میں بہت رویا ابّا۔ تم آگئے ۔ ٹھیک ہے
نہیں روتا۔ یہ لو مُسکرایا ۔ ابّا۔ بہت اچھا کیا جو تم پھر چلے آئے
دیکھو گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا ۔ وہ جو مکان دیکھ رہے ہو ۔ کالونی
کہلاتی ہے ۔ پکے مکان ہیں سب ۔ سیلاب! ہا۔ ہا ۔ ہا۔ ان
کی بات چھوڑ ابّا ہمارے کچے مکان بھی اب محفوظ ہیں۔ نہیں
سمجھے ۔ بچے بن کر آئے ہو نا۔ تمھاری عقل ہی نہیں ہے ۔ پہلے
بتاؤ تم سچ مچ میرے ابّا ہو نا۔ جادوگر تو نہیں ۔ اماں کہتی
تھی وہ جادوگر ہی تو تھا جو بھیس بدل کر ہمارے گھر کا راشن اُڑا
لے جاتا تھا۔ ہاں ۔ جادوگر کے پاس راشن کا انبار لگا ہے —
تم ہی بھولے ابّا آ ہو گے ۔ [illegible] آئے ۔ اچھا کھڑا رہیں

تمہیں اندر لاتا ہوں۔ کھڑکی سے ہی اندر آ جا ابّا۔ جلدی۔ اُدھر کیا دیکھ رہے ہو ابّا۔ وہ جو پتھر تمہیں نظر آ رہے ہیں — جانتے ہو کیا ہے۔ نہیں۔ تم نہیں جانتے نا۔ تمہیں معلوم ہوتا تو ایسا ہی باندھ نہیں بنا لیتے۔ پھر نہ تو سیلاب آ جاتا۔ نہ تو زمین بہہ جاتی۔ نہ گھر۔ نہ گاؤں اور نہ مال بہہ جاتی۔ تم بھی زمین کی نہیں کیوں گھر چیتے۔ بس پانی نہیں تو ڈیم پانی دیتی ہے اور بہت پانی ہے تو ڈیم پانی روک لیتی ہے۔ ہاں۔ اس کو ہم ڈیم کہتے ہیں۔ بولو تو کیا۔ ارے تو بولو گے بھی کیسے۔ بچے ہو نا۔ جانتے ہو یہ ڈیم ہم بنا رہے ہیں۔ میں ہی نہیں۔ وہ — شامو۔ رحمٰن۔ بلونت۔ رضیہ۔ سیتا۔ سبھی تو بنا رہے ہیں۔ مگر۔ مگر۔ ہاں۔ ابّا۔ وہ اس وقت سب سوتے ہیں۔ نہیں۔ نہیں ان کو اگر میں جگا بھی دوں تب بھی وہ باہر کیسے نکل سکیں گے۔ ہڑتال ہے نا۔ کالو دادا کہتا ہے جب تک ہماری مانگیں پوری نہیں۔ ہوتیں۔ کام بند۔ ٹھیک ہے کام بند کام بند تو چولا بند۔ مگر تجھے کیا۔ تو تو دودھ پی لے گا۔ اپنے ہی خون سے اچھی پیاس بجھاتا کیا بیٹا ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ دودھ بھی خون ہی ہوتا ہے۔ نا سمجھ۔ اچھا — ابّا۔ تم جلدی سے اندر آؤ۔ آؤ نا اندر۔ ورنہ پولیس والا گولی مار دے گا۔ ہاں کرفیو ہے نا۔ وہ لوگ کام پر جانے

کے لئے کہہ رہے ہیں نا - ارے جلدی سے اندر آ - گولی لگ گئی تو ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا - ہوں کیسے ملے گا - وہ دیکھو - ادھر چلی جیپ کے سامنے خون سے لت پت لاش - ڈاکٹر کی ہی تو ہے - مگر کیا بیچارہ - ڈاکٹر کو کالو دادا نے مارا ہاں - ہسپتال بھی کالو دادا کے آدمیوں نے جلا یا - وہ دفتر بھی - اف یہ کھڑکی کس نے بند کی !! - کس نے یہ کھڑکی بند کی - جواب تو دو - سب بہرے ہو گئے کیا - ہوا کے جھونکے نے - یہ ہوا کا جھونکا ہے یا طوفان — اف - یا دھر - اف - زلزلہ - ! - اف !! - اف وہ چلا گیا - وہ اب لوٹ کر نہیں آئے گا - یہ جانتے ہوئے بھی تم کیوں چیخ رہی ہو - کیوں اپنے بال نوچ رہی ہو - اف یہ کیسی آواز - تمہارا پیٹ پھٹ گیا کیا - اچھا ہوا - بچہ تو - مگر - ڈاکٹر - ڈاکٹر - کہاں ہے ڈاکٹر - کہاں ہے مسیحا !— تکلیف ہو رہی ہے نا - دیکھ ساری رات تو تقریباً کٹ گئی - بس چند لمحے اور - چند گھنٹے اور - چند دن اور چند سال اور - دیکھ اس میں میرا کیا قصور ہے - دیکھ وہ پھر آ گیا - کھڑکی خود بخود کھل گئی ہے وہ دیکھ وہ دیکھ - مگر نہیں - یہ وہ نہیں ہے - پھر یہ کون - آہ - اُف ! - بچاؤ !! یہ سانپ آج پھر اپنے بل سے نکل رہا ہے آہستہ آہستہ - چوہے کو کھا جائے گا - ہاں - پھر ڈر کس بات کا - مگر اگر یہ

سانپ! نہیں۔ نہیں۔ اماں کہتی تھی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ انسان بن جاتا ہے۔ اور پھر انسانوں میں گھل مِل کر راتوں کو ان کا خون پی جاتا ہے۔ جیسکا جو پڑ چکا تھا انسان کا خون پینے کا۔ اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ پھر سانپ بن جاتا ہے۔ مگر ہمارے جسم میں خون ہے بھی۔۔ پھر ڈر کس بات کا۔ مگر یہ سانپ تو نہیں۔ مر گئے یہ زیر تعمیر باندھ کے اوپر سے پانی اچھل کر بہہ رہا ہے۔ یہ پانی۔ اف۔ وہی آواز۔ شر۔ شر۔ شر۔ اُف یہ چارہی ڈیم۔ ایک بیوہ کی طرح پانی کی چادر اوڑھ کر سسک رہی ہے اُف یہ بارش۔ خدا رو رہا ہے۔ رونے دو۔ مگر نہیں۔۔۔ دادا۔ کالو دادا۔ کالو دادا۔ توڑ دے ہڑتال باندھ ٹوٹ رہا ہے۔ گاؤں ڈوب رہا ہے۔ اف۔ یہ کیا۔ زمین ہل رہی ہے۔ ڈیم اپنی جگہ سے ہلنے لگا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ ڈیم نہیں۔ یہ یہ۔ یہ۔ تم۔ تم۔ تم۔ ارے یہ تو وہی کالا دیو ہے جسے میں نے کل رات خواب میں دیکھا تھا۔ بھیانک چہرہ۔ آگ برسانے والا۔ میرے گلستاں کو کچلنے والا۔۔ اف۔ اف۔۔ یہ پانی۔ آگ۔ دھول۔ دھواں۔ سوکھے کھیت۔ بھوکے لوگ۔ بکے آدمی۔ بھٹکے انسان۔ خدا کا قہر۔ قہر آدم۔ بارش۔ کڑکتی دھوپ۔ ڈیم۔ ہڑتال۔ فیکٹری۔ جلوس۔ گولی۔ گھیراؤ۔ نعرے۔ غدار۔ ایجنٹ۔ لیڈر۔ اف

یہ شور و غل - مگر پھر بھی تم سو گئیں - ٹھیک ہے سو جاؤ - مگر تمہارا بچہ! - میرا بچہ!! - وہ ابا نہیں تھا - پھر بولتا تھا - مسیحا - اگر وہ کہاں گیا - لوٹ کر نہیں آئے گا - مگر کب! - کب!! - کب!! - تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو - ارے تم کہاں گئیں - ابھی تو یہیں تھی تم - مگر کہاں گئیں تم - کہاں ہو تم - دیکھو میں کب سے صدائیں دے رہا ہوں - ہا - ہا - ہا - عجیب و غریب - تم بھی کیسی عورت ہو - بالکل میری ماں جیسی رات بھر چیختی رہتی - کرب و کراہن سے خود بھی تڑپتی ہو اور مجھے بھی تڑپاتی ہو - چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھاتی ہو - گویا ساری دنیا کو ظلم کی داستان سنا رہی ہو - ہاں بچہ ہونے والا ہے - ڈاکٹر کو بلاؤ - نرس کو بلاؤ - دنیا کو بلاؤ - مگر صبح ہوتے ہی خود - ہا - ہا - ہا - ہا - جانے کہاں چلی جاتی ہو - اچھا اچھا سمجھ گیا - تو بھی پریوں کی طرح چادر اوڑھ کر غائب ہو جاتی ہے - خود سب دیکھ رہی ہے - مگر کسی کو دکھائی نہیں دے رہی ہے - ہے نا؟ مگر کیوں - مگر کیوں - کیوں چھپ جاتی ہو تم - ڈر لگ رہا ہے - کس سے مجھ سے - ہا - ہا - ہا - مگر آج میں تمہیں ڈھونڈ ہی لوں گا - تمہیں بھی اور تمہارے بچے کو بھی - اماں کو بھی اور ابا کو بھی - مگر یہاں چادر بھی تو نہیں ہے! مٹی کا ڈھیر ہے - مٹی میں دھنس گئی ہو گیا! پھر تو کیسے ڈھ

کر آئے گی۔ ابّا بھی لوٹ کر نہیں آئے۔ اماں بھی لوٹ کر نہیں آئی۔ میرا بھیا بھی لوٹ کر نہیں آیا۔ تو کیا سچ مچ یہاں نہیں ہو۔ تم واقعی مر چکی ہو۔ پھر میں زندہ کیوں ہو۔ کیوں زندہ ہوں میں؟ میں مر کیوں نہیں جاتا۔ میرا وجود ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔؟ اچھا اچھا۔ اب سمجھا۔ میں زندہ ہوں خواب دیکھنے کے لئے۔

خواب!۔ خواب!!۔ خواب!!!۔ دن کو خواب۔ رات کو خواب۔ صبح سے شام تک خواب۔ اٹھتے بیٹھتے خواب — چلتے پھرتے خواب۔ مگر یہ خواب ٹوٹتے کیوں ہیں۔ تم کیوں جواب دے رہی ہو۔ تم سے تو میں نے نہیں پوچھا۔ پر یہ لوگ کون والی ہے کون۔ اف!۔ اف!!!۔ وہی زنجیر کی کھنک۔!
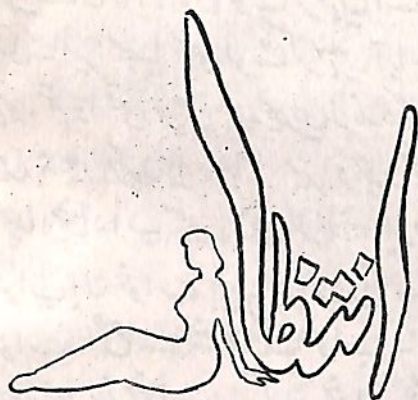
سواریوں سے بھری ایک بس جوں ہی سامنے سے نکل گئی تو اسے ایسے لگا جیسے کوئی غیبی طاقت کائنات کو اٹھا کر تیزی سے بھاگی جارہی۔ ٹکٹکی لگائے وہ بس کو تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ سڑک کی چہل پہل بھی پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہوگئی اور وہ دل شکستہ ہو کر بس اسٹانڈ کے چھت کے نیچے بیٹھا آس پاس ایسے دیکھتا رہا جیسے کسی گمنام جزیرے میں پھنسا ہوا مسافر کسی بچاؤ جہاز کی راہ دیکھ رہا ہو۔

سڑک ایک ویران سرائے کی طرح خاموش تھی۔ نہ کوئی آرہا تھا اور نہ کوئی جارہا تھا۔ فقط موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور کبھی کبھار خاموشی کو چیرتی ہوئی بادلوں کی گرج اسے

ایسے چونکا دیتی تھی جیسے رات کی تنہائی میں ایک چھوٹے سے ریلوے
اسٹیشن پر انتظار کرتے ہوئے تنہا مسافر کو سیٹی کی آواز۔ ایک گیند کی
طرح اچھل کر جب وہ سڑک پر تیزی سے دوڑتے ہوئے بارش
کے پانی کو دیکھنے لگا تو سڑک کے ساتھ ساتھ لگے بجلی کے قمقموں
کے دھندلے دھندلے عکس اسے نظر آنے لگے جیسے رعنائیاں ہاتھ
پاؤں مار کر سمندر کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے بچاؤ کے لئے صدائیں
دے رہی ہوں۔ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے دھوئیں کی لکیروں
کو دیکھتے ہوئے چلنے وہ کیا سوچ رہا تھا کہ اس کی نظریں پانی کی تہہ
کو کاٹتے ہوئے دو حسین پیروں پر رک گئیں۔ گویا کوئی پُرکشش رقاصہ
ایک دودھیا آبشار کے اچھلتے ہوئے پانی سے گھنگروؤں کو بجاتے
ہوئے ہلکے ہلکے سُروں میں گاتے ہوئے اپنے پاؤں دھو رہی تھی یا پھر
ایک صاف و شفاف جھیل میں سفید سفید بطخوں کی حسین جوڑی تیر
رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانسوں کی رفتار
تیز ہوتی گئی اور اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر جب اس بے حد
حسین راہ گزر کو غور سے دیکھا تو وہ تیزی سے ایسی بھاگی جا رہی
تھی جیسے سنگِ مرمر کا تراشا ہوا ایک دلکش بُت خانے سے نجات
پاکر روح کی تلاش کر رہا ہو۔ ہانپتی ہوئی عورت جب اس کے
سامنے رُک گئی تو وہ مسرت سے جھومنے لگا۔ گویا جنت کی
ایک حُور اپنے دامن میں دُنیا کی تمام خوشیاں لئے اس کی خالی

جھولی کو بھرنے کے لئے آئی ہو۔ وہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکی تھی۔
بھیگے کپڑوں سے لپٹے ہوئے اس کے گورے گورے بدن کی قربت
کا احساس اس قدر سہانا تھا کہ چھونے کو جی چاہتا تھا۔ وہ جوان
تھی گویا ایک سلگتا ہوا شعلہ جو دل کو جلا کر جسم کو تسکین دینے کا
بھروسہ دلا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بہت پیارے تھے۔ آنکھوں میں
چمک تھی اور آواز اتنی سریلی جیسے کوئی ایرانی مغنیہ اپنی نازک نازک انگلیوں
سے ساز چھیڑ کر محبت کی داستان سنا رہی ہو۔ پانی کی بوندیں اس کے بالوں
سے ایسی نکل رہی تھیں جیسے پھولوں کی جھرمٹ سے برسات کا پانی قطرہ قطرہ
اس کے خوبصورت گالوں کو چوم چوم کر اس کی نیم عریاں چھاتی کے آغوش میں
ایسے پناہ لے رہا تھا۔ جیسے عاشق کے دل میں معشوق کا پیار۔ وہ مخاطب
یوں تھی۔ جیسے شیریں جوئے شیر میں غوطہ لگا کر فرہاد کی منتظر ہو۔ بارش
زور زور سے برستی رہی اور وہ دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال
وجواب کرتے رہے چند ہی لمحات کے بعد ایک سرگوشی نے احساسات کا سلسلہ
توڑ دیا۔ گویا حسن کی دیوی بت پرست سے پرستش کی قیمت مانگ رہی تھی اس
نے فوراً ہاں میں سر ہلایا اور اقرار کے ساتھ ہی اس کے جسم میں ایک گرم لہر
تیزی سے دوڑنے لگی وہ اس کی کیفیت بھانپ گئی اور مسکراتے ہوئے
جب اس نے اپنا گیلا آنچل نچوڑا تو ایک مضبوط گرفت نے اس کو
دبوچ لیا۔ وہ بار بار اس کے بوسے لیتا رہا اور اس کے روئی جیسے
نرم نرم جسم کو دباتا رہا۔ وہ جب جاپ اس کی ... اور احمقانہ

حرکتوں کو دیکھتی رہی اور سب کچھ برداشت کرتی رہی اچانک بادلوں کی گرج نے اسے چونکا دیا اور اسے ایسا لگا، جیسے کوئی اسے آواز دے رہا تھا۔ پالتھین کا ایک چھوٹا سا بیگ اپنے سینے سے لگا کر جب وہ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تو سامنے ایک لمبی سڑک تھی۔ سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے مسلح سپاہیوں کی طرح ٹکٹکی لگائے ایسے کھڑے تھے جیسے وہ سب کے سب اس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اسکوٹر اسٹارٹ ہوا تو تیز روشنی نے دھندلی دھندلی روشنی پر غلبہ پایا اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر پریوں کے دیش جا رہی تھی۔

"کہو۔ کہاں جانا ہے۔؟" ایک کھردری آواز نے اسے چونکا دیا۔

"پہلے جہاں تم لے چلو اور پھر اسی سڑک پر آگے ایک نئی بستی ہے۔ بستی کیا چند بے گھر لوگوں کے کھوکھلے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ایک زور کے دھماکے کے ساتھ اسکوٹر سڑک کو رگڑتا ہوا ایسے رک گیا جیسے کوئی راہی پہیوں کے نیچے کچلا گیا ہو۔ لائٹ آف ہو گئی اور سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے جلدی سے اپنے بلاوز کے ہوک کھول دیئے اور آہستہ سے کہنے لگی۔

"لیکن یہ تو سڑک ہے، یہاں کیوں روک دیا؟"

"اسکوٹر آگے نہیں جائے گا۔" آواز میں بے رخی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔"

"لیکن مجھے یہ سودا منظور نہیں۔" آواز میں تلخی آنے لگی۔

"کیوں۔ میں خوبصورت نہیں؟" وہ فریاد کرنے لگی۔

"سفر بہت لمبا ہے کم از کم دس روپے کا میٹر بن جائے گا۔" وہ یک دم موسم کی طرح بدل گیا اور اس کا چہرہ ایسے تھا جیسے تپتے ہوئے پربت نے اچانک برف کی چادر اوڑھ لی ہو۔

"تم خاموش کیوں ہو .... بھگوان کے لئے میری بات مان لو اور مجھے اپنی منزل پر پہنچا دو۔ میرے بچے بھوک سے بلک بلک کر رو رہے ہوں گے اور میرا مرد دوائی کے لئے ترس رہا ہوگا۔"

"تو میں کیا کروں۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ میرے پاس نہ روٹی ہے اور نہ دوائی۔ فقط ادھار کا ایک لیٹر تیل ہے۔" وہ کھانستے ہوئے کہنے لگا۔

بادل گرجتے رہے۔ پانی برستا رہا اور وہ دونوں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایسے ٹہلنے لگے جیسے ایک کلینک کے باہر کینسر کے دو مریض۔ وہ سواری کا منتظر تھا اور وہ بس، اسکوٹر ٹیکسی یا کار کی متلاشی تھی دونوں دور دور تک نظریں دوڑا کر جانے کب تک انتظار کرتے رہے۔